لنگر خانہ

جاوید صدیقی

کتاب دار

لنگرخانہ

(کچھ خاکے، کچھ خاکہ نما)

جاوید صدیقی

لنگر خانہ

(کچھ خاکے، کچھ خاکہ نما)

جاوید صدیقی

کتاب دار

نام کتاب : **لنگرخانہ** (کچھ خاکے، کچھ خاکہ نما)

مصنف : جاوید صدیقی

پتہ : ۱۰۴، وینس II، نوکرن مارگ، چار بنگلہ، اندھیری (ویسٹ) ممبئی - ۵۳

اشاعت : ۲۰۱۵ء

سرورق : شاداب رشید

سرورق تصویر : انجلی ایلامینن

جاوید صدیقی پورٹریٹ : امینہ انصاری

قیمت : ۲۵۰

ناشر : کتاب دار، جلال منزل، ٹیمکر اسٹریٹ، ممبئی - ۸

LANGAR KHANA

by Javed Siddiqi

Add: 104, Venus II, Navkiran Marg, Four Bunglows, Andheri(W), Mumbai-400 053. Tel: 26354576 - Mob: +91-9821-178-786.

Email: javed@javedsiddiqi.com.

Ist Edition: 2015

Cover Design: Shadab Rashid

Cover Painting: Anjolie Ela Menon

Javed Siddiqui Portrait: Amina Ansari

Rs. 250/-

Publisher: KITAB DAAR, 108/110, Jalal Manzil, Gr. Floor, Temkar Street, Mumabi - 400 008, Tel : 2341 1854 / 9869-321-477 / 9320-113-631

(پرنٹیک آفسیٹ، گائے واڑی، ممبئی سے شائع ہوئی)

ابّو، امّاں اور بھیّا

کے نام

کاش آپ لوگ ہوتے.......

فہرست

عرض ہے کہ...

۲۰۱۱ء میں جب میرے خاکوں کا مجموعہ ''روشن دان'' شائع ہوا تو میری وہی حالت تھی جو ایک کمزور طالب علم کی ہوتی۔ وہ امتحان تو دے آتا ہے مگر ڈرتا بھی ہے کہ پتہ نہیں جولکھ کر آیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط؟ ___ پاس ہوگا یا فیل؟

'روشن دان' کی پذیرائی جس طرح ہوئی وہ میرے خواب وخیال سے پرے کی چیز ہے۔ اگرچہ میری انگلیوں اور قلم کا رشتہ پچاس سال سے زیادہ پرانا ہے۔ اس عرصے میں سیکڑوں اخباری کالم لکھے، کوئی سات درجن فلمیں لکھیں، پینتیس (۳۵) سے زیادہ ناٹک اور سیریل لکھے، کچھ کہانیاں بھی لکھیں۔ ان کوششوں کو سراہا بھی گیا، نام اکرام اور انعام سب سے نوازا بھی گیا مگر جو کام 'روشن دان' کے دس خاکوں نے کیا اس کی توقع تو کیا تصور بھی نہیں تھا۔ ایسی ایسی تعریفیں ہوئیں کہ آنکھوں میں آنسو آگئے:

''ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی؟''

اور مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ میں نے وہ منظر بھی دیکھا جب بمبئی کے ایک سیمینار میں ٹیگور پر تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اچانک رُک گئے اور فرمایا: ''ابھی ابھی ہال میں جاوید صدیقی داخل ہوئے ہیں جن کی کتاب 'روشن دان' پچھلے دس سالوں میں شائع ہونے والی دس بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔''

اور میرے کانوں نے لاہور سے آتی ہوئی انتظار حسین صاحب کی آواز بھی سنی جو کہہ رہے تھے: ''بھئی آپ کے خاکے پڑھنے کے بعد مجھے ترقی پسند بھی اچھے لگنے لگے ہیں۔''

ہائے یہ الفاظ اس کے ہیں جس کی تحریروں سے لکھنے کا سلیقہ سیکھا ہے اور وہ بات کہہ رہا ہے جسے سننے کے لیے پوری ایک تحریک آخر وقت تک بے تاب رہی۔ مجھے لگ رہا ہے دو چار

مثالیں اور دے دیں تو کہا جائے گا کہ اپنے ہاتھ سے اپنی کمر ٹھونک رہا ہوں۔ اس لیے موضوع بدلتا ہوں۔

ایک دوست نے بڑی محبت اور ہمدردی سے کہا: "آپ کے خاکے، خاکہ نگاری کے لگے بندھے اصولوں پر پورے نہیں اترتے۔"

آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر، ارے حضرت! یہ خاکے کیا خاک ہیں، یہ تو میرے جذبات اور محسوسات نے مل کر ایک طلسم بندی کی ہے۔ قسم لے لیجیے جو مجھے معلوم ہو کہ خاکہ نگاری کے اصول کیا ہیں یا خاکے کے اجزائے ترکیبی کیا ہوتے ہیں۔ مَیں نے تو وہی کیا جو غالبؔ نے کہا تھا:

"بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ"

بھائی الیاس شوقی نے کہا یہ خاکے ہیں۔ مَیں نے مان لیا کیوں کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ قابل ہیں اور خاکوں کی ایک کتاب بھی مرتب کر چکے ہیں، لیکن اگر اب بھی کسی کو لگتا ہے کہ یہ خاکے نہیں ہیں تو مجھے کوئی شکایت نہیں ہوگی بلکہ مَیں تو کہوں گا:

"تم کوئی اچھا سا رکھ دو میرے ویرانے کا نام"

اب "لنگر خانہ" کی شکل میں کچھ خاکے اور کچھ خاکہ نما لے کر حاضر ہو رہا ہوں، دل اسی طرح دھڑک رہا ہے جیسے "روشن دان" کے وقت دھڑکا تھا۔ ہتھیلیوں میں پسینہ بھی ویسا ہی ہے مگر ایک اطمینان بھی ہے کہ اس مرحلے میں تنہا نہیں ہوں۔

ہمت بڑھانے والوں کی تو ایک لمبی فہرست ہے مگر رہ نمائی کرنے والے بھی کم نہیں ہیں۔ جن کا ارشاد ہے۔

ذرا سنبھال کے لفظوں کو جوڑیئے صاحب
کہ اس مکان میں ایک عمر تک رہے گا کوئی

میں نے اپنی صلاحیت کے مطابق پوری کوشش کی ہے کہ ادب نوازوں کو مایوس نہ کروں، پھر بھی سر تسلیم خم ہے، ان کا فیصلہ سر آنکھوں پر...

میرے ہمدردوں میں سر فہرست عزیز دوست گلزار صاحب ہیں جو ہمیشہ میری کمر ٹھونکنے کو تیار رہتے ہیں۔ اس بار بھی انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود نہ صرف یہ کہ "لنگر خانہ"

کا مسودہ منگا کر تمام خاکے پڑھے بلکہ ان پر ایک خاکہ بھی لکھ دیا۔ میں گلزار صاحب کی محبت، عنایت، اور ذرہ نوازی کا ممنون ہوں۔

میں شکر گزار ہوں عالمی شہرت یافتہ مصورا نجلی ایلامینن کا جنھوں نے ''لنگر خانہ'' کے سرورق کے لیے اپنی ایک پینٹنگ عطا فرمائی۔

بھائی الیاس شوقی کا شکریہ ادا کروں تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں مگر آج مجھے ان کی ناراضگی منظور ہے۔ اگر وہ نوک پلک درست نہ کرتے تو اس کتاب میں وہ ادا نہ ہوتی جو ہے۔

شاداب رشید کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، اپنی زبان سے محبت اور ادب کی خدمت تو ان کا شعار ہے ہی۔ ادیب نوازی میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ پچھلے مہینے ''روشن دان'' کا چوتھا اڈیشن شائع کیا ہے اور اب ''لنگر خانہ'' کی تیاری ہے۔ خدا ان کی محنت کو کامیاب کرے!

یوں تو میں اپنی بیوی کا شکریہ روز ہی ادا کرتا ہوں کہ ان کی وجہ سے کھانا وقت پر مل جاتا ہے اور شام ہوتے ہی گھر جانے کو جی چاہتا ہے مگر یہ شکریہ خاص ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک مضمون لکھا ہے اور وہ بھی مجھ پر۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ مضمون میں میری بہت تعریف کی گئی ہے۔ جو اچھی بیویوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔ مگر کسی کو بگڑتے کیا دیر لگتی ہے اس لیے یہی کہوں گا۔ شکریہ فریدہ!

آپ نے ''ماں پر پوت پتا پر گھوڑا'' کی کہاوت تو سنی ہی ہوگی۔ میرے گھر میں بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔ ماں کی دیکھا دیکھی بیٹے سمیر نے بھی میرے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے میں سمیر کی تحریر کی ایمانداری سے۔ بہت متأثر ہوں اور ممنون بھی۔ سلامت رہو سمیر!

مجھے جو عرض کرنا تھا، کر چکا، اب آپ جانیں اور ''لنگر خانہ''

''سارا حساب سود و زیاں کر دیا میاں''

''جو دل کے بیچ تھا وہ بیاں کر دیا میاں''

نیاز مند

جاوید صدیقی

ممبئی، نومبر ۲۰۱۵ء

جاوید صدیقی - خاکے پر خاکہ

آپ کیا جانتے ہیں جاوید صاحب کو؟ یہی جن کی کتاب آپ پڑھنے لگے ہیں۔ مَیں تعارف کرادوں! بڑے ہنس مکھ ہیں اور انھیں کے انداز میں کہوں، جو آپ کتاب میں پڑھنے والے ہیں، جوانی میں اور بھی ہنس مکھ رہے ہوں گے۔ اُن کی ایک بیٹی اُن کی ہنس مکھی پر گئی ہے۔ جاوید اپنی سفید مونچھوں کی بہت دھونس دِکھاتے ہیں۔ اپنی اردو سے بھی زیادہ۔ بات کرتے ہوئے گردن تھوڑی سی دائیں طرف جھکا لیتے ہیں جیسے آپ کا پورٹریٹ دیکھ رہے ہوں۔ گستاخی کی حد تک ایماندار ہیں، کچھ اور بھی اچھائیاں ہیں جس میں اچھی شراب کا شوق بھی شامل ہے۔
شوہر کیسے ہیں؟ ایک اچھے شعر کی طرح موزوں لگتے ہیں، لیکن باپ بہت اچھے ہیں۔ بچوں سے بہت لاڈ کرتے ہیں، پیار کرتے ہیں۔ یہ بچوں کی خوبی ہے کہ وہ خراب نہیں ہوئے۔

ایسا جذباتی آدمی ظاہر ہے کہ ہر قدم پر رشتوں سے لپٹتا رہا ہے اور یار شتوں کو ریشمی دھاگوں کی طرح اپنے گرد لپیٹتا رہا ہے۔ یہ رشتے صرف انسانوں سے نہیں، گلی کوچوں سے، شہروں سے اور اپنے دور کی تہذیب سے بھی لپٹے ہوئے ہیں۔ یقین مانیے اس تہذیب کو جس طرح مَیں نے جاوید صاحب کے خاکوں میں دیکھا ہے، پڑھا ہے اور محسوس کیا ہے وہ اب نہ بمبئی، سوری ممبئی میں نظر آتا ہے نہ لکھنؤ میں!!

ایک اور بات: جاوید صاحب کی کوئی بات من گھڑت نہیں ہوتی۔ کسی کی زندگی میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کرتے۔ حالاں کہ میری زندگی میں اُن کا ہونا ہی ایک بڑا اضافہ ہے۔ وہ نوجوانوں کے خاکے نہیں لکھتے۔ آدمی (یا عورت) بوڑھا ہو جائے، مواد جمع ہو جائے تو پھر وہ لکھ دیتے ہیں۔ خود سوچ کر کچھ نہیں لکھتے۔ خود وہ ہر کہانی میں شامل ضرور ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے

کیمرہ نہیں ہوگا تو کچھ درج کیسے ہوگا۔ وہ دیکھ رہے ہیں اسی لیے تو سب درج ہو رہا ہے۔ جیسے خاکہ 'ستیہ جیت رے' کا ____ !

کیا خوب 'رے' لگایا ہے اس آدمی کے ساتھ، بس نام ہی رکھ دیا۔

جاوید صاحب کے ڈرامے، خاکے پڑھ کے مَیں اکثر کہہ اُٹھتا ہوں: "ارے؟" حیران ہوتا ہوں لیکن ریت کے ذرے میں سورج دِکھا دینا جاوید صاحب کا کمال ہے۔ 'ستیہ جیت رے' کے لیے کہہ دینا:

"کیا آدمی تھا رے..."

سچ تو یہ ہے کسی بھی شخصیت کی تعریف میں تفصیل سے خوبیاں لکھ دینا، صفات بیان کر دینا، اتنا مشکل نہیں جتنا ایک شخصیت کو کام و عمل میں دِکھا کر اس کی صفات ظاہر کر دینا۔ جاوید نے کچھ نہیں کہا لیکن 'رے صاحب' کے ساتھ اپنے تجربے کو بیان کر کے سب کچھ دِکھا دیا، سب بیان کر دیا۔ اور ان کے طرزِ بیان کے لیے مجھے بار بار "ارے... ارے" کہنا پڑتا ہے۔ سنیے:

"مَیں بھی انھیں حویلیوں کا پروردہ تھا جہاں کسی زمانے میں وقت تھم کر بیٹھ گیا تھا اور پھر اینٹ اینٹ بکھیر کر باہر نکل گیا تھا۔"

"واجد علی شاہ کی لفظیت دوسری ہے۔ اس میں ایسی نغمگی ہے جو بندش میں آجائے تو ٹھمری معلوم ہونے لگے۔"

"کلکتہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ پہلے بھی کئی بار آچکا تھا مگر وہ شہر مجھے کبھی پسند نہیں آیا۔ جدھر دیکھو ایک بے ترتیب ہجوم دِکھائی دیتا تھا۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے کوئی پرانا پتھر ہٹایا اور نیچے سے لاکھوں چیونٹیاں بلبلا کر باہر نکل آئی ہوں۔ اب اسے وقت کی ستم ظریفی ہی کہیے کہ کچھ دن بعد چیونٹیوں کے اس بے ترتیب ہجوم میں مَیں اور شمع بھی شامل ہو گئے۔"

"نمائے گھوش پنجوں کے بل آگے بڑھتے اور فوٹو کلک کر کے اس طرح سیدھے ہوتے جیسے برجو مہاراج توڑا لیتے ہیں۔"

میں کون گلی سے نکروں
ہر موڑ پہ شیام کھڑے

کسی خاکے سے گزر جائیے، کسی بھی شخصیت کو چھو کے نکلیے، ہر افسانے اور خاکے کے مطلع اور مقطع پر جاوید کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کے بغیر یہ شخصیتیں بیان ہو ہی نہیں سکتیں۔ ایک جملے میں اپنی نانی کا حسن بیان کر جاتے ہیں:

"حوریں اگر بوڑھی ہوتیں تو بالکل میری نانی جیسی نظر آتیں!"

اسے ماسٹر سٹروک کہتے ہیں۔ ایک برش میں پورا پورٹریٹ کھڑا کر دیا___ پھر کہتے ہیں:

"کھڑاؤں والی سیدانی کے نام سے مشہور تھیں۔ کیوں کہ انھوں نے کبھی کوئی جوتا چپل نہیں پہنا۔ سنا ہے شادی کے وقت سہاگ کے جوڑے کے ساتھ کھڑاؤں پہن کر سسرال آئی تھیں اور کھڑاؤں بھی ویسی ہی جیسی شری رام پہنتے تھے اور جو بعد میں بھرت جی نے لے جا کر ایودھیا کے سنگھاسن پر رکھ دی تھیں۔"

"وہ ایک ایسی ایکٹریس نظر آتی تھیں جو اپنے کیریکٹر کے اندر جانے کر باہر آنا بھول گئی ہوں۔"

جاوید بولے:

"انگریزی میں 'ہو' کے معنی ہے کون۔ تو 'اللہ ہو' کے کیا معنی ہوئے؟۔۔۔ 'اللہ کون'۔۔۔ توبہ توبہ تم اللہ کی ذات پر سوال اٹھاتی ہو"

اور اس پر قصہ اللہ ہو کا _____ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ جاوید اس موڑ پر کھڑے نظر آئے۔

ایم ایف حسین کو ہم بھی جانتے تھے، مگر اس طرح نہیں جس طرح جاوید جانتے تھے۔ ان کی سٹرگل (Struggle)، ان کی غریبی، ان کی فقیری بھی جانتے تھے مگر فقیری میں بادشاہی جاوید نے دیکھی۔ کھولائی ہوئی چائے کے گلاسوں میں، تاج ہوٹل میں ایک ٹانگ کرسی پر رکھ کر قیمہ پاؤ کھاتے ہوئے۔

اچھا کیا جاوید صاحب نے وارث علوی سے ملوادیا____ ان کی گلی اور گھر دیکھ لیا۔ پیڑ بھی دیکھ لیا پام کا!____ ایک ملاقات ہی رہی بس، لیکن ان کے اپنے ہی الفاظ میں کہوں۔

"وہ کیا زمانہ تھا جب ملاقات خود ایک وجہ ہوا کرتی تھی____ ملنے کی!"

سوشلسٹوں میں ہر کمزوری اور خوبی کے ساتھ ایک بڑی خوبی یہ بھی دیکھی ہے کہ بات بڑی بے باکی سے کرتے ہیں۔ شمع اس پر سو فی صدی کھری اترتی ہیں____ وہ ایک شخصیت اور رشتے کی کہانی ہے____ شمع زیدی کی شخصیت ایک روشن شمع کی طرح سامنے آتی ہے۔

"شمع کے پاس ایک Remington Portable ٹائپ رائٹر تھا جسے وہ لاد کر ہر جگہ لیے پھرتی تھیں۔ جب بھی لکھنے کا وقت آتا تو کچھ یوں ہوتا کہ پہلے سین پڑھا جاتا۔ سین سن کر اگر شمع کا سر ہل جاتا تو یہ سگنل ہوتا کہ گاڑی آگے بڑھ سکتی ہے۔ وہ Remington کے کی بورڈ پر انگلیاں رکھ کر میرے بولنے کے انتظار آنکھیں بند کر لیتیں۔ اس وقت ان کے چہرے پر وہی معصوم سنجیدگی ہوتی جو انڈوں پر بیٹھی ہوئی کبوتری کے چہرے پر ہوتی ہے۔"

اور جاوید صاحب کے ساتھ جو رشتہ ہے وہ انھیں کا حق ہے۔ تال میل میں ایک طبلہ پورا نہیں اتر سکتا____ دایاں بایاں دونوں کا ہونا لازمی ہے ورنہ صرف بایاں "ڈگا" کہلانے لگتا ہے۔ اور شمع کی بے باکی: ماشاءاللہ!

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

اکبری بوا کا پڑھنا ایک دعوت ہے:

"بوا نے ایک پیڑھی گھسیٹی اور اپنی ٹوکری کے پاس بیٹھ گئیں۔ انھوں نے کسی جادوگر کی طرح ٹوکری پر ڈھکا ہوا گیلا کپڑا ہٹا دیا۔ بوا کی ٹوکری کے بیچ میں ایک بڑی مٹکی ہوتی تھی جس میں دہی بھرا ہوتا تھا۔ ایک دوسری چھوٹی مٹکی میں بیسن کی پھلکیاں رکھی رہتی تھیں۔ مٹکی کے چاروں طرف بڑے سلیقے سے مٹی

چینی کی چھوٹی بڑی پیالیاں، مسالوں کے ڈبے اور چمچے سجے ہوتے تھے۔ بوا ایک پیالی اٹھاتیں، اسے سوکھے کپڑے سے رگڑ کر صاف کرتیں، پھلکیوں والی مٹکی سے کچھ پھلکیاں نکالتیں اور انھیں پیالے میں رکھ کے ہاتھ سے توڑ دیتیں۔ پھر باری باری سے نمک، موٹی موٹی کُٹی ہوئی لال مرچ، گرم مسالہ اور چاٹ مسالہ ڈال کر چمچے سے مکس کرتیں، پھر اتنا دہی ڈالتیں کہ پیالی بھر جاتی۔ دہی کے اوپر ہرے دھنیے کی چار چھ پتیاں رکھتیں اور پسا بھُنا زیرہ اس طرح چھڑکتیں جیسے پیالی کو نظر کا ٹیکا لگا رہی ہوں"

منھ میں پانی آگیا۔ پڑھتے ہوئے مَیں نے کئی بار منھ پونچھا ____ پکانا اکبری بوا کا اور پروسنا جاوید صدیقی کا ____ ماشاءاللہ!

سچ یہ ہے کہ جاوید صاحب کے ساتھ بہت جگہ گئے، گھومے۔ رامپور دیکھا، پُرانی بمبئ دیکھی، کلکتہ کی گلیاں بھی گھوم آئے، لیکن جس طرح جاوید صاحب نے لکھنؤ کو سنبھالا ہے اور بیان کیا ہے۔ وہ اب چاہے کتنا ہی افسانوی لگے، بقول سلیم عارف: ہے۔ بہت۔ بہت بھرا ہوا۔ تہذیب اور کرداروں سے لبریز ____!

حکایتوں میں بہت ذکر رہتا ہے اب بھی
سنائی دیتا ہے لکھنؤ داستانوں میں

گلزار

جئے ہو جاوید صاحب

صبح کے کوئی ۶ ربجے ہوں گے، میرے اسکول جانے کا وقت تھا اور میں خلافت ہاؤس سے باہر نکل رہی تھی کہ میں نے دیکھا گیٹ کے باہر ایک ٹیکسی رکی، اس کا دروازہ کھلا اور پہلے ایک چھوٹا سا ٹرنک نکلا جو شاید ٹین رنگ کا تھا، جس میں مشکل سے پانچ چھ جوڑے کپڑے آسکتے ہوں گے۔ اس کے بعد ایک بڑا سا سر نظر آیا جس پر بال ہی بال تھے اتنے گھنے کہ چہرہ اس میں چھپ گیا تھا مگر آنکھوں پر ایک موٹے فریم کا چشمہ صاف نظر آرہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اس فریم کے پیچھے آنکھیں ضرور ہوں گی جو نظر نہیں آرہی تھیں۔ ٹرنک سنبھالتا ہوا وہ لڑکا خلافت ہاؤس کے گیٹ کے اندر آیا، مجھے چوں کہ اسکول کے لیے بس پکڑنی تھی اس لیے میں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔ بس اسٹاپ چوں کہ دور تھا اس لیے راستے میں چلتے چلتے سوچنے لگی یہ بے چارہ کون ہو سکتا ہے۔ شاید خلافت ہاؤس میں زاہد شوکت علی سے کچھ مدد مانگنے آیا ہے، یا رہنے آیا ہے، یا ہو سکتا ہے ان کا کوئی رشتہ دار ہو، بہر حال سوچتے سوچتے میری بس آگئی اور میں اسکول پہنچ گئی۔

چوں کہ ہمارا گھر بھی خلافت ہاؤس ہی میں تھا اس لیے شام کو واپس آئی تو دیکھا وہی صاحب جو صبح دکھائی دیے تھے بڑے صاف ستھرے کپڑے پہنے تخت پر بڑی گہری نیند میں سو رہے تھے۔ ہمارا گھر خلافت کا ایک بڑا سا کمرہ تھا جس کے ساتھ باتھ روم، کچن اور ٹائیلیٹ جڑے ہوئے تھے۔ برابر ہی ایک دوسرا کمرہ تھا اور ایک بہت بڑا سا مشترکہ ہال بھی تھا جس میں ایک بڑی ڈائننگ ٹیبل تھی۔ ایک لمبا سا تخت بھی تھا جو دیوار سے لگا ہوا بالکل ڈائننگ ٹیبل کے برابر تھا۔ جس کے دوسری طرف کرسیاں لگی تھیں اور جس پر کوئی بیس لوگ بیٹھ سکتے تھے۔ میں دل میں سوچنے لگی آخر یہ ہے کون۔ اندر روم میں گئی تو ابا سے پوچھا۔ انھوں نے بتایا:

"یہ بچہ رام پور سے آیا ہے اور میں اس کے باپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ شجاعت بھائی کا بیٹا ہے۔ شجاعت بھائی کا تو انتقال ہو چکا ہے اس لیے اسے زاہد صاحب نے بلا لیا ہے۔ زاہد صاحب اس کے چچا لگتے ہیں، اب اٹھے گا تو تفصیل معلوم ہو گی۔ میں نے تمہاری ماں سے کہہ دیا ہے اس کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو دے دینا اور بہت خیال رکھنا"۔

یہ تھے جاوید۔ ہمارا گھر ایک طرح سے اوپن ہاؤس تھا۔ مسافر ہو، پڑوسی ہو، یا خلافت اخبار میں کام کرنے والے کاتب، کوئی بھوکا نہیں سو سکتا تھا اس لیے جاوید کا زیادہ خیال رکھنا پڑتا تھا۔ جاوید کو خلافت اخبار میں کاپی جوڑنے اور ترجمہ کرنے کا کام مل گیا تھا۔ وہ اپنی قابلیت کے بل پر ترقی کرتے گئے۔ ان میں دلوں کو جیتنے کا آرٹ ہے اور ہر ایک کے دل پر راج کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ میرے دونوں بھائی، بہن اور ماں باپ پر اپنی باتوں سے ایسا جادو کیا کہ جس دن وہ گھر نہ آتے تو ہم سب کو ایسی بے چینی ہوتی کہ بس۔ پتہ نہیں کیا جادو تھا ان کی باتوں میں کہ سب کا دل چاہتا تھا کہ یہ قصے کہانیاں، لطیفے سناتے رہیں اور ہم سب بس سنتے رہیں، جس دن کسی وجہ سے نہ آتے تو گھر میں سناٹا ہو جاتا۔ ویسے بھی ہمارے گھر میں کم بولا جاتا تھا۔ خاص طور پر لڑکیوں کے لیے زیادہ زور سے ہنسنا، اونچی آواز میں بولنا یا کسی سے بھی زیادہ بات کرنا بہت برا مانا جاتا تھا۔ اسی لیے جاوید جب بھی ہمارے گھر میں آتے تھے تو ہم دونوں بہنیں دور سے ہی ان کی باتوں کا مزہ لیتی تھیں۔ ایک دن اچانک میں نے دیکھا وہ چشمے کو ذرا نیچے کر کے مجھے گھور رہے تھے، کچھ عجیب سا لگا مگر میں نے اس کو ٹال دیا۔ کبھی کبھی ان کی باتوں سے بھی ایسا لگا کہ وہ مجھے پسند کرنے لگے ہیں لیکن کوئی خاص توجہ نہیں دی اس لیے کہ میں جانتی تھی یہ سلسلہ آگے بڑھنا ممکن نہیں ہے کیوں کہ میرے کزن کے ساتھ میری منگنی ہو چکی تھی جو کینیڈا میں رہتے تھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کو خط بھی لکھا کرتے تھے۔ بہت جلد ہماری شادی ہونے والی تھی۔ لیکن جاوید میں کوئی بات تھی جو نہ چاہنے پر بھی میں ان کی طرف کھنچی جاتی تھی۔ ان کی غیر معمولی معلومات سے بھی میں متاثر تھی اور سوچتی تھی کہ اتنی کم عمری میں یہ شخص کتنا جانتا ہے۔ ساتھ ہی محنت اور آگے بڑھنے کا جذبہ بھی ان میں بہت تھا۔ ان ہی دنوں انھوں نے خلافت اخبار میں

ایک کالم لکھنا شروع کر دیا جس کا عنوان تھا "باغ و بہار" یہ بہت مقبول ہوا۔ اس کالم کے لیے وہ لوگ بھی جو خلافت کم پڑھتے تھے، نہ صرف اخبار پڑھنے لگے بلکہ ان کے کام کا لوگوں کو انتظار رہتا کہ دیکھیں آج انھوں نے کس موضوع پر لکھا ہے۔ پالیٹکس ہو یا تھیٹر ہو یا ادب، ایسا کوئی میدان نہیں کہ جس پر ان کی گرفت نہ ہو۔ وہ لوگوں کے چہرے پڑھ لیتے تھے۔ حالاں کہ وہ مذہبی آدمی نہیں ہیں۔ پھر بھی انہیں قرآن پاک کی بہت سی آیتیں اور سورتیں یاد ہیں اور معنی بھی جانتے ہیں ساتھ ہی دیگر مذاہب کی جان کاری بھی خوب رکھتے ہیں اور ہر مذہب کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ شاید اسی لیے لوگ انھیں پسند کرتے تھے۔

زاہد مما سے ملنے کے لیے تقریباً سارے ہی منسٹر آیا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک قاضی صاحب بھی تھے۔ جو شاید ہاؤسنگ کے منسٹر تھے انھوں نے جاوید کی قابلیت دیکھی تو انھیں اپنی اسپیچ لکھنے کی نوکری دے دی۔ ان دنوں جاوید کافی پریشان تھے۔ ایک تو میری طرف سے کہ میرے گھر والے ہمارے رشتے پر راضی نہ تھے، دوسرے خلافت اخبار سے کیوں کہ زاہد شوکت علی ہر وقت کچھ نہ کچھ ان میں نقص نکالتے ہی رہتے تھے۔ وہ یہ بھول جاتے تھے کہ یہ میرا بھتیجہ ہے۔ زاہد مما تو زاہد مما ہی تھے ہمیشہ نوابوں کی زندگی گزاری وہ بھلا کیسے جھکتے۔ شاید اسی لیے جاوید نے خلافت چھوڑ دیا اور قاضی صاحب کی نوکری کرنے لگے۔ مگر جب زاہد مما بیمار پڑے اور خلافت کو دیکھنے والا کوئی نہ رہا تو اپنی اچھی بھلی نوکری چھوڑ کر واپس خلافت میں آگئے۔ اس سے خلافت کا فائدہ تو ہوا، میرا فائدہ زیادہ ہوا کہ ہمارے ٹوٹے ہوئے رشتے پھر جڑنے لگے۔

میرے دونوں بڑے بھائی ہمارے رشتے کے سخت خلاف تھے اس لیے کہ جو آدمی پوری طرح سیٹل نہیں ہو اس کے ساتھ رشتہ کیسے طے کیا جاسکتا ہے اور پھر سوال میری منگنی کا بھی تھا۔ حالاں کہ میری امی کی بھی Love marriage ہوئی تھی۔ ان کے نکاحی باپ مولانا شوکت علی تھے۔ ہماری ماں نے جب اسلام قبول کیا تو پھر پیچھے مڑ کر کبھی نہیں دیکھا۔ میرا معاملہ تھوڑا سا الگ تھا۔ مجھے اپنے گھر میں سب سے زیادہ بھائیوں سے ڈر لگتا تھا اس لیے جاوید سے ہمیشہ غصے سے بات کرتی تھی جس کی وجہ سے وہ اس وقت تک گھر پر آنا جانا بالکل بند کر دیتے

تھے، جب تک کہ سامنے والا معافی نہیں مانگ لے۔شاید یہ بری عادتیں ان میں آج بھی ہیں۔ایک بات اور بھی ہے اب آپ اسے اچھا کہیں یا برا، وہ جو ٹھان لیں کہ مجھے یہ چیز حاصل کرنا ہے تو حاصل کر لیتے ہیں۔اس کی سب سے بڑی مثال تو میں ہوں۔آج ہماری شادی کو چالیس برس گزر گئے، ہم نانا نانی بن چکے ہیں لیکن ان کی وہ چھوٹی چھوٹی ضد یں۔کبھی روٹھ جانا اور پھر منوانا یا منانا مجھے آج بھی بہت پسند ہیں۔ان کو Sorry کہنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔اگر نہیں کہا تو نقصان میرا ہی ہوتا ہے۔میرے خیال سے اگر جھک جاؤ تو سامنے والا اپنی غلطی کا احساس خود کر لیتا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ ایک عورت کو اگر اپنے گھر کو جنت بنانا ہے تو چھوٹی بڑی قربانیاں دینا ہی پڑتی ہیں۔میں نے اکثر دیکھا ہے مرد اپنی غلطی کبھی نہیں مانتا لیکن احساس ہو جانے کے بعد Sorry ضرور بول دیتا ہے اور سامنے والا Sorry سن کر خوش ہو جاتا ہے اور دل ہی میں کہتا ہے کہ کاش۔! یہ غلطیاں اسی طرح چلتی رہیں اور ہم ایک دوسرے کو Sorry بولتے رہیں۔جاوید دل کے بہت اچھے ہیں۔مجھے کئی ناموں سے پکارتے ہیں۔جیسے مصیبت، گل گچیا بیگم، کبھی کبھی بچوں کی اماں بھی پکارتے ہیں مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ان میں یہ ایک اور اچھی عادت ہے کہ اگر میں کوئی کام کر رہی ہوں اور وہ کچھ کھا رہے ہوں تو وہ مجھے کھلاتے جاتے ہیں، کبھی کبھی میں بھی یہی کرتی ہوں کہ اگر وہ لکھ رہے ہوں اور کھانے کا ہوش نہ ہو تو مجھے کھلانا پڑتا ہے۔کبھی ناراض ہوں اور ہم دونوں میں بات چیت نہیں ہو تو بھی پلیٹ میں میرے لیے کچھ چھوڑ کر ضرور جاتے ہیں۔

ان میں جو بہت اچھی بات ہے وہ یہ کہ بہت سچے ایماندار اور بہت پیار کرنے والے انسان ہیں۔ایمانداری کی تو حد کر دیتے ہیں۔جب ان کو کوئی پروڈیوسر کہانی سنانے آتا ہے اور اگر انھیں ایسا لگے کہ یہ کہانی صحیح نہیں ہے، فلم چلے گی نہیں تو وہ پروڈیوسر کے منہ پر ہی سچ بول دیتے ہیں۔انھوں نے ۱۰۰ کے قریب فلمیں لکھی ہیں جن میں سے بہت سی سپر ہٹ ہیں اور تقریباً ۵۰ کے قریب ناٹک لکھے ہیں۔جاوید میں ایک اور اچھی عادت یہ ہے کہ جب بھی وہ ناٹک لکھتے ہیں تو پہلے اپنی فیملی کو سناتے ہیں جس میں میرے داماد، بیٹیاں، بیٹے بھی شامل

ہوتے ہیں۔ جب جاوید نے 'تمہاری امرتا' ناٹک مکمل کیا تو ہم سب کو سنایا اور سب کی رائے پوچھی سب نے الگ الگ رائے دی، مگر میں چپ رہی مجھ سے جاوید نے پوچھا تم کچھ نہیں بول رہی ہو تمہیں کیسا لگا۔ میں نے جاوید سے کہا: "مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اسٹیج پہ دو آرٹسٹ بیٹھے لیٹرز پڑھ رہے ہیں۔" جاوید چپ ہو گئے اور کہا کہ اس کا جواب دیکھنے پر ہی مل سکتا ہے اور جب میں نے پہلی بار 'تمہاری امرتا' دیکھا تو ہال میں آڈینس کا ردِ عمل جاننے کے لیے چاروں طرف نظر ڈالی، میں نے دیکھا کہ آڈینس اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں رہی تھی اور واہ واہ کی ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں واہ! کیا بات ہے۔ یہ شبانہ اور فاروق شیخ کا کمال تھا۔ جنھوں نے جاوید کے ہر لفظ میں جان ڈال دی تھی۔ یہ ناٹک ساری دنیا میں کھیلا گیا اور ہر جگہ سے جاوید کی واہ واہ ہوئی۔ اس کے بعد جاوید نے 'تمہاری امرتا' کا سیکویل لکھا جس میں فاروق شیخ اور سونالی بیندرے تھیں۔ وہ بھی اسی طرح مشہور ہوا جس طرح تمہاری امرتا مشہور ہوا تھا۔ اس کے بعد جاوید نے نادرہ ببر کے لیے 'بیگم جان' لکھا جس میں نادرہ جی کا خود کہنا ہے کہ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا اور اچھا ناٹک ہے۔ جب جاوید 'شیام رنگ' لکھ رہے تھے تو جاوید نے ہم سب سے ایک بات کہی تھی کہ جب مہابھارت میں شری کرشن کا نام آتا ہے تو رادھا جی کا کیوں نہیں؟ اس پر انھوں نے یہ ناٹک لکھا اور اس کے کافی کامیاب شوز ہوئے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ جب تک آپ 'شیام رنگ' کو دیکھیں گے نہیں، آپ اس ناٹک کی باریکیاں سمجھ نہیں سکیں گے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ جاوید ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ بہت اچھی نظمیں اور غزلیں لکھتے ہیں۔ میں امید کرتی ہوں کہ وہ کسی نہ کسی دن ضرور شائع ہوں گی۔ انھوں نے میرے لیے جو نظمیں لکھی تھیں وہ تو اب نہیں ملتیں، مگر ہماری بیٹی لبنیٰ کے لیے جو لوری لکھی تھی "نیند پری آ" وہ میری آواز میں لبنیٰ اور سلیم ہی کے ایک ناٹک میں ریکارڈ کی گئی ہے اور اس طرح محفوظ ہو گئی ہے۔ آڑان' ٹی وی سیریل کے لیے بھی انھوں نے ایک لوری لکھی ہے۔ ایک دو فلمی گانے بھی لکھے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ ان کا سارا کلام شائع ہو جائے تا کہ لوگوں تک پہنچے۔ جاوید کے کئی دوست ہیں لیکن اگر وہ کسی سے سچے دل سے دوستی کرتے ہیں تو آخر تک نبھاتے ہیں۔ کچھ دوست تو ایسے تھے جن کے لیے

بہت کچھ لٹایا مگر وہ اپنا الو سیدھا کر کے بھاگ گئے۔ مگر جاوید کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی پھر چاہے انہیں کچھ بھی کرنا پڑے۔ ایسے کئی اسٹنٹ جنھوں نے جاوید سے سیکھا اور آدھا کام چھوڑ کر چلے گئے۔ مگر جاوید نے ہمیشہ ان کی مدد کی اور یہی کہا اگر ان کو کوئی اچھا چانس ملتا ہے تو ان کا چلا جانا ان کا حق ہے۔ کچھ دوست ایسے بھی ہیں جو بغیر کسی لالچ کے جاوید کے لیے آوٹ آف داوے جا کر کام کرتے ہیں۔ جن میں الیاس شوقی، اسلم پرویز اور راہن بھٹ ان کے بہت قریب ہیں۔ شاید ان لوگوں نے جاوید میں کوئی نہ کوئی اچھی بات ضرور دیکھی ہوگی۔ جاوید کے چاہنے والوں میں ایک اور نام لکھنا چاہوں گی وہ ہے گلزار بھائی کا۔ جاوید سے ان کی محبت کے کئی ثبوت ہیں۔

جاوید نے فلم انڈسٹری میں جتنی عزت کمائی اتنے پیسے نہیں (اور یہ حقیقت ہے ایک بیوی کی شکایت نہیں) آج وہ جو کچھ ہیں اپنی قابلیت محنت اور سب سے بڑی بات اپنی ایمان داری کی وجہ سے ہیں۔ آج خدا نے ان کو ہر وہ چیز دی ہے جو انھیں ملنی چاہیے تھی۔ عزت، دولت، شہرت اور ایک اچھی فیملی۔ آج ہمارے سب بچے اپنی اپنی جگہ خوش ہیں۔

جاوید کی زندگی سے ایک ہی سبق ملتا ہے کہ اگر انسان میں کچھ پانے کی سچی لگن ہو تو وہ سب کچھ پا سکتا ہے چاہے کام ہو، نام ہو یا محبوبہ ہو۔ جئے ہو جاوید صاحب۔!

خدا کرے کہ آپ ایسے کئی ''روشن دان'' اور ''لنگر خانہ'' لکھیں تا کہ چھوٹی چھوٹی لائنیں لکھنے کا مجھے بھی موقع ملے۔

فریدہ جاوید صدیقی

پاپا۔ڈیڈ۔۔۔جاوید صاب

پاپا۔۔۔۔ڈیڈ۔۔۔۔جادو۔۔۔۔سر۔۔۔۔جاوید صاب، یہ سب سچویشن طے کرتی ہے کہ میں اُنھیں کب کس نام سے بلاؤں گا مگر جس نام سے بھی بلاؤں اُن کا جواب ایک ہی ہوتا ہے ''جی سمیر صاحب بولیے۔'' اور یہ سنتے ہی مجھ میں ایسا بریک لگتا ہے کہ جو میں بولنے والا تھا یا تو بھول جاتا ہوں یا پھر ہڑبڑاہٹ میں آخری بات پہلے کر دیتا ہوں یا پہلی بات آخر میں کہیں چلی جاتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے 'جی سمیر صاحب بولیے' میں کچھ اپنا پن بھی ہے، پرایا پن بھی ہے، کچھ عزت بھی ہے اور کچھ طنز بھی چھپا ہوا ہے۔ میں اکثر سوچ میں پڑ جاتا ہوں 'یار یہ کیسا باپ ہے۔'' سگا بیٹا ہوں تھوڑی سی انفارملیٹی تو جائز ہے۔ مگر نہیں صاحب ان کا نام جاوید صدیقی ہے اور وہ تہذیب کے پلندے ہیں! میں نے اکثر انھیں یہ کہتے ہوئے سنا ہے اگر کسی کو گالی دینی ہے تو اِتنی پیار سے دو کہ سامنے والے کو برا بھی نہ لگے اور بات اُس کی سمجھ میں بھی آجائے! یہ باتیں سیکھنے کے لیے جنم درکار ہے بلکہ شاید اس کے لیے مجھے اگلا جنم لینا پڑے اور اگر ایسا ہوا تو میری خواہش ہوگی کہ پھر جاوید صدیقی کا ہی بیٹا بنوں تاکہ دو چار باتیں اور سیکھوں......

چند لفظوں میں پاپا کو سمجھنا، ان کی پوری تربیت، اس کا پس منظر، سوچ اور شخصیت کا جائزہ لینا مشکل ہے۔ کیوں کہ جس پہلو سے دیکھا جائے ان میں بہت گہرائی نظر آتی ہے۔ ایک اچھے پاپا کے ناطے، اچھے شوہر کے ناطے، بھائی، دوست، ساتھی وغیرہ جو بھی ہو...... ان کی زبان نہیں بدلتی، نپی تلی باتیں ہوتی ہیں نہ ایک لفظ زیادہ اور نہ ایک لفظ کم، سامنے والے کی سمجھنے کی جتنی صلاحیت ہوتی ہے اُتنا ہی بولتے ہیں اور کم لفظوں میں بہت کچھ بیان کر دیتے ہیں۔ ویسے بھی کم لفظوں میں بہت کچھ بیان کر دینا ایسی کلا ہے جو اوپر والا چُن چُن کے لوگوں میں دیتا ہے۔

ایسی ہی بات جاوید صاحب میں بھی ہے اور پھر ان کا فلسفہ بھی تو کمال کا ہے۔ ''لفظوں کو بڑی احتیاط سے برتا کیجیے ان میں جان ہوتی ہے۔''

جب بھی میں کہیں کیسی ڈائیلاگ یا سچویشن (صورتِ حال) میں پھنس جاتا ہوں تو وہ اکثر مجھ سے کرتے ہیں، ''تم کیریکٹر کے پوائنٹ آف ویو سے نہیں سوچ رہے ہو سمیر...... آوڈینس (سامعین) کی طرح مت سوچو۔ کیریکٹر میں اترو اور جب اترو گے تو اپنے آپ چیزیں سامنے نظر آنے لگیں گی کیوں کہ ہر کیریکٹر اپنی زبان خود لے کر آتا ہے۔! اگر کیریکٹر کے پوائنٹ آف ویو سے سوچو تو زیادہ دماغ پر زور ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑے گی نہ تم سَر پکڑے ہوگے اور نہ اپنے آپ کو کوس رہے ہوگے کہ میں کہاں یہ رائیٹنگ کے چکر میں پڑ گیا اچھا بھلا کیمرہ مین تھا!''

دیکھا جائے تو صحیح بھی ہے۔ صحیح سے یاد آیا پاپا کو یہ لفظ 'صحیح' پاکستان کی دین لگتا ہے۔ کیوں کہ ہم نے وہاں ہر کسی کو یہ لفظ بات بات میں بولتے سنا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر وہاں آپ کسی سے پوچھیں ''بھائی طبیعت وغیرہ کیسی ہے؟؟'' تو جواب آتا ہے 'صحیح ہے' اور اگر پوچھیے تحفہ کیسا لگا تو بھی جواب یہی ہوتا ہے۔ 'صحیح ہے'......

خیر کیمرے سے رائیٹنگ تک کا سفر ان معنوں میں طے ہوا کہ مجھے بنانی ہیں فلمیں اور اس کے لیے ضروری ہے فلم بنانے کے طور طریقے جاننا۔ ظاہر ہے وہ تب آئیں گے جب آپ ہر چیز سیکھیں گے۔ لہٰذا اسسٹنٹ کے طور پر کام کرنا شروع کیا۔ پہلے ڈائریکشن پھر کیمرے پر، دونوں جگہ سے نکالا گیا یہ کہہ کر کہ تم سوچتے بہت ہو۔ اس لیے مجھے ایسی فیلڈ (میدان) ڈھونڈنا پڑی جو میری سوچ کو اور بڑھاوا دے...... بہت سا وقت یہ سوچنے میں لگ گیا کہ کیا کیا جائے۔ پاپا ہمیشہ کہا کرتے تھے 'سمیر صاحب کو یہ پتا نہیں کہ یہ آ رہے ہیں یا جا رہے ہیں' اب بتائیے۔ جس کے پاپا جاوید صدیقی ہوں اُسے کہیں اور جاننے کی ضرورت ہے۔ چناں چہ گذشتہ دس برسوں سے مَیں لگ گیا فائل ڈرافٹ کرنے، اسٹینو ٹائپسٹ وغیرہ وغیرہ بننے میں...... اس دس سال میں یہ تو نہیں کہہ سکتا ہوں کہ میں اچھا رائٹر بن گیا ہوں مگر ہاں اس دوران بہت کچھ سیکھنے کو ملا،

'لیجینڈری' جاوید صدیقی صاحب ہے! لیکن جیسا کہتے ہیں رائٹنگ ایسا فن ہے کہ رائٹر جتنا پرانا ہوتا جاتا ہے اس کی رائٹنگ اُتنی ہی جوان، لہٰذا میں سمجھتا ہوں پاپا اس وقت ۳۰ سال سے اوپر کے نہیں ہیں کیوں کہ اُن کی سوچ میں اِتنی تازگی ہے، اتنا نیا پن ہے کہ بعض اوقات میں حیرت میں پڑ جاتا ہوں کہ میں جوان ہوں یا یہ!

خیر پاپا کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔! اُن کی گرفت اردو اور انگریزی زبان پر بہت زبردست ہے۔ حالاں کہ پاپا اردو میڈیم اسکول سے پڑھے ہیں، انگریزی انھوں نے بہت بعد میں جا کر سیکھی ہے مگر دونوں زبانوں پر انھیں یکساں مہارت حاصل ہے۔ میرے ساتھ بالکل اُلٹا ہوا ہے میں نے انگریزی اسکول سے پڑھا ہے اور اردو بہت بعد میں جا کر سیکھی ہے۔! اردو لکھنا پڑھنا میں نے ۲۰ دنوں میں سیکھ لیا تھا۔ ایک بہت با کمال مولانا سے جو گھر پر آ کر پڑھاتے تھے۔ ابتدا ہی قرۃ العین حیدر کی کتاب چاندنی بیگم سے ہوئی، بے چارے مولانا اسے کیا سمجھاتے وہ تو ایک لائن سے آگے نہیں بڑھ پاتے تھے، دراصل پیچھے کھڑے پاپا اُسے بھی سمجھاتے جاتے تھے اور مجھے بھی، یہ اردو سیکھنے کا شوق مجھے بچپن سے رہا ہے ظاہر ہے بچپن سے سنتا آیا تو کان آشنا ہو گئے تھے مگر پھر بھی اردو بہت پھیلی ہوئی زبان ہے اور ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں۔ استعمال پر منحصر ہے اور سمجھنے والے پر ہے! میں اپنے سیکھنے کے دنوں میں بہت سی بڑی بڑی غلطیاں کرتا تھا جیسے ایک بار جب ہمارے گھر ایک مہمان آئے ہوئے تھے انھیں چھوڑنے کی باری آئی تو میں نے لپک کر کہا پاپا میں انھیں رُسوا کر کے آتا ہوں سب ہنس پڑے، رُسوا؟؟ میں سوچ میں پڑ گیا، ایسا کیا بول دیا بھئی میں نے۔ پاپا نے کہا اَبے رُسوا نہیں رخصت کر کے آتا ہوں۔! کان کا آشنا ہونا کبھی کبھی بیک فائر (اُلٹا اثر) بھی کرتا ہے!

پاپا اپنے لفظوں سے ایسا جادو پھیلا دیتے ہیں کہ بس کوئی بھی ہو ایک بار مل لے پھر زندگی بھر کا دوست بن کر رہ جاتا ہے۔ کچھ مقناطیسی شخصیت ہے جاوید صاب کی! بچپن سے میں دیکھتا آیا ہوں، جب ہم کرلا میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہا کرتے تھے اور پاپا کا آفس اوپر کھلے ٹیرس پر ہوتا تھا، ایک کونے میں چٹائی بچھی ہوتی تھی جس پر سفید چادر اور کچھ کُشن اور گاؤ تکیے

رکھے ہوتے تھے۔ پاپا اپنی لنگی کرتے میں بیٹھے آسمان کی طرف دیکھتے جاتے، سوچتے جاتے اور پیڈ پر کچھ لکھتے جاتے تھے۔ بیچ بیچ میں چائے کی چسکیاں بھی ہوتی تھیں اور کچھ کچھ منٹوں سے سگریٹ کے دھوئیں بھی نکلتے رہتے تھے۔! شام کے وقت بلڈنگ کے سارے لڑکے ٹیریس پر ان کے سامنے بیٹھے ہوتے۔ پاپا کچھ شعر سناتے جاتے یا پھر کچھ دلچسپ قصے اور وہ لوگ واہ واہ کرتے رہتے۔ دوست تو بہت تھے خیر کچھ ایسے بھی تھے جو فلم بنانا چاہتے تھے اور فری کی اسکرپٹ کی درخواست لے کر آتے تھے، اوپر سے نہایت ہی بور قسم کے بھی ہوتے، آ کر بیٹھ جاتے تھے پھر جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ میرا بس چلتا تو میں بول دیتا ”سر پلیز بعد میں اپائنٹ مینٹ لے کر آئیے۔“ مگر نہیں، وہاں بھی پاپا کی شائستگی نظر آتی، وہ بڑے پیار سے بولتے ”اچھا جناب میں نے آپ کا بہت وقت برباد کر دیا اب اجازت دیجیے۔“ مطلب سامنے والے کے پاس جانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں بچتا!

پاپا کو میں نے ۵ کاموں سے زیادہ کچھ اور کرتے ہوئے نہیں دیکھا: پڑھتے، لکھتے، نیوز دیکھتے، ممی اور ہمارے ساتھ جملے بازی کرتے۔ ہماری ماں کی دوائیوں کے معاملے میں لاپرواہی پر پاپا ہمیں سناتے۔ ”لوگ کتا پالتے ہیں، بلی پالتے ہیں، میری بیوی بیماریاں پالتی ہیں۔“

پاپا کو مچھلیاں بہت پسند ہیں، وہ کہتے ہیں ان کو دیکھتے رہنے سے 'رائٹرس بلاک' ہٹتا ہے۔ آخری چیز جو آج کل ان کی مصروفیات میں شامل ہوگئی ہے وہ ان کے نواسے 'دیوان' کے ساتھ بات چیت کرنا ہے۔ جو ماشاء اللہ اتنا حاضر جواب ہے کہ ہم جو کبھی کبھی نئی نسل کو برا بھلا کہتے ہیں اس بچے کی عقل مندی اور حاضر جوابی پر تعجب کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اتنے سے سر میں کیسے اتنی ساری سمجھداری کی باتیں سما سکتی ہیں۔؟ مثال کے طور پر ایک دن انھوں نے سوال کیا نانا یہ برسات میں پانی اوپر سے نیچے آتا ہے، مگر یہ پانی اوپر جاتا کیسے ہے؟ جیسے ہمارے نلوں میں پانی آتا ہے کیوں جی واچ مین اوپر ٹینک کا نل کھولتا ہے نا اس لیے یہ آتا ہے پر یہ آسمان میں کون بیٹھا ہے جو نل کھول کے کبھی کبھی بھول جاتا ہے؟ پاپا کی ذہانت میرے خیال میں ایسے

موقعوں پر آ کر صفر ہو جاتی ہوگی۔ ظاہر ہے حیرت اس بات کی ہے کہ ایک ۵ سال کے بچے کو یہ سب جان کر کیا کرنا ہے؟ پانی کا نل اوپر کون کھلا چھوڑتا ہے۔ پاپا نے اِن سوالوں کی ٹوکری کا نام زندہ طلسمات رکھا ہے!

جادو نام رکھنے میں بڑے ماہر ہے، انھوں نے ہم سب کے نام تو رکھے ہی ہیں یہاں تک کے خاندان میں اور بہت سوں کے نام رکھے ہیں۔! نام رکھنے کا شوق اِتنا تھا کہ وہ کیریکٹر دیکھ کر نام رکھا کرتے اور صرف انسان ہی نہیں بلکہ دوسری چیزوں کے بھی نام رکھتے تھے۔ مثلاً پاپا نے اس بید کا نام تک رکھا تھا جس سے مجھے اور میرے بھائی کو مار پڑا کرتی تھی۔ جب بھی ہم پڑھائی کے نام پر جھوٹ بولتے اور پڑھنے کے بجائے پتنگ اڑاتے یا کرکٹ کھیلتے ہوئے پکڑے جاتے تو یہ ان کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا تھا کیوں کہ وہ جھوٹ نہ خود کبھی بولتے تھے اور نہ کبھی کسی سے سُن سکتے تھے، خاص طور پر اپنے بچوں سے! لہٰذا وہ بڑے پیار سے کرسی پر بیٹھ کر ہم دونوں کو سامنے کھڑا کرتے اور ہماری بہن کو آواز لگاتے: ''بیٹی ذرا اللہ بخش لے کر آنا۔'' اللہ بخش دو فٹ لمبی کین کی بنی ہوئی چھڑی تھی جس پر لال اور نیلے رنگ کی چٹائی جیسی چمڑے کی کھال لپٹی ہوتی تھی۔ ایک سرے پر سنہرا لٹو لگا ہوا اور دوسرے سرے سے چمڑے کے پر نکلے ہوئے۔ اس کا نام سن کر میں اور میرے بھائی تھر تھر کانپنا شروع کر دیتے تھے! نہ جانے انھوں نے اس کا اللہ بخش نام کیوں رکھا تھا۔ شاید اس لیے کے اللہ تو بخش دے گا میں نہیں بخشوں گا! میری بہن زیبا یا کبھی لبنیٰ جو ہم سے کچھ حد تک تنگ تھیں، بڑی خوشی خوشی اللہ بخش لے کر آیا کرتی تھیں مانو چائے لے کر آ رہی ہوں بس ٹرے کی کمی ہے۔ میں یہ سوچتا تھا یہ ہمیں پڑھا لکھا کر اپنے جیسا کیوں بنانا چاہتے ہیں۔ مگر اصل وجہ تھی پڑھائی پر دھیان دینا۔! مگر کون کم بخت پڑھائی پر دھیان دے گا جب کھڑکی کے باہر رنگ برنگی پتنگیں اڑ رہی ہوں یا پھر گلی میں کرکٹ کھیلا جا رہا ہو۔! خیر جیسے تیسے کر کے ہم پاس ہو جاتے اور پھر ممی پاپا کی خوشی کی جو انتہا ہوتی اس کا ذکر ہی کیا! مگر افسوس کی بات تھی کہ ایسی خوشیاں ہم انھیں ہر سال نہیں دے پاتے تھے، رُک رُک کے خوشیاں ملتی تھیں۔! پتا نہیں ایسا کیوں ہوا کہ ہم دونوں اتنے بڑے رائٹر

کے بیٹے ہو کر بھی کتابوں سے دور بھاگا کرتے تھے۔ خیر مجھے، بہت بعد میں کتابوں کا شوق ہوا اور میرا بھائی تو اب تک اس سے محروم ہے۔ وہ ہمیشہ کہتا ہے کہ پکچرس ہیں تو پڑھ کے کیا فائدہ، سارا لٹریچر تو فلموں میں مل جاتا ہے! مگر پڑھائی کے جینس نے کچھ تو ہل چل کی تھی اس میں ٹیکنیکل سوجھ بوجھ بے حد ہے، جو ہم میں سے کسی میں نہیں ہے!

جاوید صاحب کی شخصیت کے، بہت سے پہلو ہیں جسے بیان کرنے جائیں تو ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ظاہر سی بات ہے میں بیٹا ہوں، اپنے باپ کی تعریف تو کروں گا ہی، ویسے سچ پوچھیں تو ایمان سے برائیاں ڈھونڈنے کے لیے دماغ پر، بہت زور ڈالنا پڑے گا۔! اب بس اس مضمون کو یہیں بریک لگاتا ہوں، جو اب میرا زیادہ اور پاپا کا کم لگ رہا ہے۔

امید ہے کہ املا جملہ ٹھیک ہوگا اور زیادہ غلطیاں نہیں ہوں گی!

سمیر صدیقی

کیا آدمی تھا رے!

اکتوبر ۱۹۷۶ء تک ستیہ جیت رے سے میرا تعلق بس اتنا تھا کہ میں نے ان کے بارے میں دو چار مضامین پڑھے تھے۔ اور آٹھ دس فلمیں دیکھی تھیں۔ فلمیں جتنی بھی دیکھیں بہت اچھی لگیں کیوں کہ ایسی فلمیں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ مجھے ان کی ''جلسہ گھر'' بہت پسند آئی تھی۔ کچھ تو بیگم اختر کی وجہ سے اور کچھ اس لیے کہ میں بھی انھیں حویلیوں کا پروردہ تھا جہاں کسی زمانے میں وقت تھم کر بیٹھ گیا تھا اور پھر اینٹ اینٹ بکھیر کے باہر نکل گیا تھا۔

ان کی فلموں کے مکالموں کی زبان سمجھ میں نہیں آتی تھی مگر تصویروں کی بولی اچھی طرح سمجھ لیتا تھا۔ مجھے ان کی فلموں کا ہر فریم زندگی سے اتنا قریب لگتا تھا کہ سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

اس زمانے میں جب ایمرجنسی لگ چکی تھی اور بہت سے جرنلسٹ عزت بچانے کے لیے گھروں میں بیٹھ گئے تھے۔ میں بھی اخبار چھوڑ چکا تھا اور وقت کاٹنے کے لیے ابرار علوی کے پاس چلا جاتا تھا۔ اسی زمانے کی بات ہے یعنی اکتوبر ۱۹۷۶ء کی...... جب شمع زیدی کا فون آیا اور انھوں نے کہا:

''اے جاوید، وہ ستیہ جیت رے تم سے ملنا چاہتے ہیں......''

میں حیران ہو گیا:

''مجھ سے؟'' وہ مجھے کیا جانیں......

''مجھے یہ سب نہیں معلوم، پریزیڈنٹ میں ٹھہریں گے۔ پرسوں شام کو

چار بجے مل لینا......!"

انھوں نے سوکھا سا جواب دیا اور فون بند کر دیا۔

بات سوچنے جیسی تھی۔ راجہ بھوج گنگو تیلی سے کیوں ملنا چاہے گا۔ شمع بی بی ضرور کوئی شرارت کر رہی ہیں۔ میری عزیز ترین دوست شمع زیدی بڑی با کمال خاتون ہیں۔ وہ بے حد سنجیدگی سے جھوٹ بولنے اور نہایت غیر سنجیدگی سے سچ بولنے کی انوکھی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کے چہرے، آواز یا الفاظ سے یہ پتا لگا لینا کہ ان کے ارادے کیا ہیں، نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اس لیے جب فون آیا تو یقین کرنے سے پہلے دیر تک سر کھجانا پڑا۔ فون کیا تھا، شمع نے ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینک دیا تھا اور میں لہر لہر پریشان ہو رہا تھا۔ فریدہ نے پریشانی کی وجہ سنی تو ہنس پڑیں:

"ارے تو اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ تم اتنے اچھے مزاحیہ کالم لکھتے ہو۔ کوئی پسند آگیا ہوگا۔ فلم بنانا چاہتے ہوں گے......!"

شوہروں کو بیویوں کی خوش گمانی عام طور پر اچھی لگتی ہے۔ مگر مسئلہ ایسا تھا کہ میں جھنجھلا گیا تو انھوں نے کہا:

"اُفوہ اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ ہوٹل میں فون کر کے دیکھ لو، اگر رے صاحب ہیں تو شمع سچ بول رہی ہیں اور اگر نہیں ہیں تو ان کا Joke سمجھ کے بھول جاؤ۔"

مشورہ کچھ اس قدر صحیح تھا کہ میں نے چپ چاپ مان لیا اور فون کیا تو معلوم ہوا کہ رے صاحب تشریف لا چکے ہیں۔ فی الحال روم میں نہیں ہیں۔ میں اور زیادہ نروس ہو گیا۔ دل کے دھڑکنے کی آواز چاروں طرف سے آنے لگی۔

"یار یہ چکر کیا ہے؟"

میں شمع سے پوچھنا چاہتا تھا مگر ان کا کیا بھروسا؟...... ڈانٹ دیں تو؟ لیکن ایک بات ثابت ہو چکی تھی، وہ شرارت نہیں کر رہی تھیں۔ ستیہ جیت رے بمبئی میں تھے، ہوٹل پریزیڈنٹ

میں تھے، کمرے میں نہیں تھے تو کیا ہوا۔

شمع نے چار بجے کا ٹائم دیا تھا۔ میں تین ہی بجے کولابہ پہنچ گیا جہاں پریزیڈنٹ ہے۔ دیر تک لابی میں گھومتا رہا جہاں چار پانچ دوکانیں تھیں۔ جب فلورسٹ کے ہر پھول کو دیکھ چکا اور کشمیری قالینوں کے سارے ڈیزائن یاد ہو گئے تو لابی فون سے نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے ایک کھرج دار مگر خوشگوار آواز سنائی دی:

"yes?"

میں نے اپنا نام ہی بتایا تھا کہ آواز آئی: "!come up" اور فون بند ہو گیا۔

ستیہ جیت رے عالمی سنیما میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے مگر وہ خود بھی اتنے اونچے ہوں گے میں نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ جب چھ فٹ چار انچ کے رے صاحب نے دروازہ کھولا تو میرا منہ بھی کھل گیا اور دیر تک کھلا رہا۔

وہ ایک شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ لمبے تھے مگر دبلے نہیں تھے۔ سانولا رنگ، کشادہ پیشانی، سلیقے سے جمے ہوئے بال، بڑی بڑی روشن آنکھیں، اونچی ستواں ناک، مسکراتے ہوئے ہونٹ، ٹھوڑی ذرا چوڑی تھی۔ کہا جاتا ہے ایسی ٹھوڑی والے بہت محنتی اور مستقل مزاج ہوتے ہیں۔

میں نے آداب کیا۔ انھوں نے سر ہلا کر جواب دیا اور کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں کرسی کے کونے پر ٹک گیا۔ وہ بیڈ پر دیوار سے پیٹھ لگا کے بیٹھے اور اپنی چمکتی آنکھوں سے جن میں ہلکی سی مسکراہٹ بھی تھی مجھے دیکھنے لگے۔ چشمے کی ڈنڈی ان کے منہ میں تھی جسے وہ دھیرے دھیرے چبا رہے تھے۔ وہ تقریباً ایک منٹ تک بنا کچھ بولے میرا جائزہ لیتے رہے۔ پھر انگلش میں پوچھا:

"میں نے سنا ہے تم بہت اچھی کہانیاں لکھتے ہو......!"

میں نے عرض کیا:

"کہانیاں کم، کالم زیادہ لکھے ہیں۔ پتہ نہیں کیسا لکھتا ہوں۔ آپ کہیں تو اپنی

کوئی تحریر ترجمہ کرالوں آپ دیکھ لیں۔"

ان کی مسکراہٹ کچھ زیادہ پھیل گئی۔ بولے:

"کوئی ضرورت نہیں، میں تمھیں دیکھ سکتا ہوں اور اتنا کافی ہے۔"

یہ کہہ کر اٹھے، تکیے پر رکھا ایک پلاسٹک کا فائل اٹھایا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگے:

"یہ میری فلم کا اسکرپٹ ہے اور تم اس کے ڈائیلاگ لکھ رہے ہو!"

پتہ نہیں مجھے کیا ہوا۔ دماغ کئی ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم گیا۔ کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور ہاتھ میں پکڑے فائل پر نظر ڈالی تو سفید پلاسٹک میں سے موٹے موٹے سیاہ حروف دکھائی دیئے: For your eyes only

مگر آنکھیں تھیں کہ بند ہوئی جا رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے کہا:

Thank you sir, I am honored sir

وہ اٹھے اور دروازہ کھول دیا:

"میں تہران فلم فیسٹول میں جا رہا ہوں۔ واپسی پر تمھیں فون کروں گا......!"

"جی" میں نے کہا اور اسکرپٹ چھاتی سے لگا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ جب ہوٹل کی لابی میں پہنچا تو ہوش ذرا ٹھکانے آئے۔

"یہ ہوا کیا؟" میں اور ڈائیلاگ، اور وہ بھی ستیہ جیت رے کی فلم کے!......ارے باپ رے!"

جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے گنے تو ہمیشہ کی طرح کم ہی تھے۔ مگر میں نے کل کی نہیں سوچی اور کولابہ سے ٹیکسی پکڑی اور سیدھا جوہو تارا پہنچا جہاں شمع رہتی تھیں۔ 25 میل لمبا رستہ کب کٹ گیا معلوم ہی نہیں ہوا کیوں کہ دماغ کہیں اور تھا۔ ذہن میں سوالوں کی آندھی چل رہی تھی جس میں جوابوں کے پیر اکھڑے جا رہے تھے۔ محمود کے کہنے پر ابرار علوی کے لکھے سین میں کانٹ چھانٹ کر دینا اور ضرورت پڑنے پر ایک آدھ سطر کا پیوند لگا دینا ایک الگ بات ہے اور باقاعدہ مکالمہ

نگاری کرنا الگ۔ اچھا بھی لگ رہا تھا اور ڈرتا بھی جاتا تھا کہ پتہ نہیں شمع نے کہاں پھنسا دیا ہے۔
میں پہنچا تو وہ مسکرا رہی تھیں۔ انھوں نے اپنی مخصوص اداسے پلکیں جھپکا کے پوچھا:
"ہوگئی ملاقات؟"
میں نے اسکرپٹ ان کے ہاتھ میں تھما دیا:
"ہوگئی...... یہ دیکھو...... اوراب بتاؤ کہ ڈائیلاگ کیسے لکھتے ہیں؟"
شمع نے بڑے ادب سے فائل کو دیکھا۔ پیار سے اس کے اوپر ہاتھ پھیرا اور بولیں:
"Don't be silly...... ڈائیلاگ لکھنا کون سا مشکل کام ہے۔"
میں بھڑک گیا:
"ارے یار تم بھی کمال کرتی ہو۔ پریم چند کی کہانی، ستیہ جیت رے کا اسکرین پلے...... اگر ذرا سی بھول چوک ہوگئی تو لوگ پکڑ پکڑ کے ماریں گے۔"
"کوئی نہیں مارے گا۔ کچھ نہیں ہوگا!"
قصہ مختصر طے یہ پایا کہ ہم دونوں مل کر لکھیں گے۔ زبان میری، تجربہ ان کا۔ شمع کو تجربہ کے ساتھ سلیقہ بھی تھا۔ وہ کچھ چھوٹی موٹی فلموں اور "گرم ہوا" میں اپنا ہاتھ صاف کر چکی تھیں۔ مگر یہاں خالص اردو لکھنی تھی۔ سب سے پہلے ہم نے اسکرپٹ پڑھا۔
مانک دا نے (وہ لوگ جو ستیہ جیت رے کے قریبی تھے انھیں مانک دا کہا کرتے تھے۔ مانک ان کا گھریلو نام تھا) ہاں تو مانک دا نے ایک چھوٹی سی کہانی کو کافی پھیلا دیا تھا اور اس وقت کی سیاست کو بڑی خوبصورتی سے کہانی کے اندر لے آئے تھے۔ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کا مذاق اڑانے کے بجائے اس کی کمزوریوں کا ذکر کیا تھا مگر اسے ایک ایسا بادشاہ دکھایا تھا جو اپنی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ انگریزوں کی مکاری کی وجہ سے سلطنت کھو بیٹھتا ہے۔
ہمارے سامنے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اگر ہم وہی زبان لکھتے ہیں جو اس وقت رائج تھی تو آج کے

فلم بین سمجھ ہی نہیں پائیں گے کیوں کہ محاورہ بدل چکا ہے۔ الفاظ اور ان کا استعمال بھی وہ نہیں ہے جو تھا۔ چناں چہ ہم نے طے کیا کہ ہم ایک ایسی زبان لکھیں گے جو آسان اور عام فہم ہوگی۔ مگر سنتے ہوئے ایسا لگے گا جیسے وہ ڈیڑھ سو سال پہلے کی اردو ہے۔ ہم نے یہ بھی طے کیا کہ کرداروں کی زبان مختلف ہوگی۔ اور اس میں ان کی سماجی، ثقافتی اور معاشی جھلک دکھائی دے گی۔

اگر آپ ''شطرنج کے کھلاڑی'' کے مکالموں کی زبان پر غور کریں تو آپ کو احساس ہوگا کہ میر اور میرزا کی زبان الگ ہے۔ واجد علی شاہ کی لفظیت دوسری ہے۔ اس میں ایسی نغمگی ہے جو بندش میں آجائے تو ٹھمری معلوم ہونے لگے۔ درباریوں کی زبان پر فارسی کا غلبہ ہے۔ عوام اودھی بولتے ہیں اور خواتین کہاوتوں اور محاوروں سے سجی ہوئی رواں دواں بولی بولتی ہیں۔ ہم نے کوشش کر کے پوری فلم میں ایسا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا جو کانوں کو برا یا گراں معلوم ہو۔

اردو کا کمال یہ ہے کہ اس میں ایک لامحسوس موسیقی ہے۔ اگر قلم کسی جان کار کے ہاتھ میں ہے تو لفظ، لفظ نہیں رہتے سر بن جاتے ہیں۔ میرے اور شمع کے جوش کا عالم یہ تھا کہ اپنا ہوش نہیں تھا۔ روزانہ بارہ چودہ گھنٹے کام کرتے مگر ذرا سی بھی تھکان کا احساس نہیں ہوتا۔

اسکرپٹ دھیرے دھیرے آگے بڑھتا گیا اور بہت سے رازوں سے پردہ بھی اٹھتا گیا۔ معلوم ہوا کہ ستیہ جیت رے تک میرا نام پہنچانے والی شمع ہی تھیں اور اس سفارش کے پیچھے ایک کہانی تھی۔ جب پروڈیوسر سریش جندل نے مانک دا کو راضی کرلیا کہ وہ ہندی یا اردو میں فلم بنائیں گے اور انھوں نے پریم چند کی کہانی ''شطرنج کی بازی'' کا انتخاب کیا تو سوال پیدا ہوا کہ اس کے مکالمے کون لکھے گا۔ ہر اچھے اسکرین پلے کی طرح ''شطرنج کے کھلاڑی'' میں بھی مفہوم اور ضرورت کو سمجھانے کے لیے انگریزی مکالمے لکھ دیے گئے تھے مگر وہ مکالمے نہیں تھے، وہ تو اشاریے تھے جن کی مدد سے اس تاریخی فلم کے مکالمے لکھے جانے تھے۔ سریش جندل کا خیال تھا کہ شطرنج کے ڈائیلاگ راجندر سنگھ بیدی سے بہتر کوئی لکھ ہی نہیں سکتا۔ فلم کے ایک ہیرو تھے سنجیو کمار۔ وہ چاہتے تھے کہ گلزار سے مکالمے لکھوائے جائیں جو اپنی زبان کی سادگی اور مٹھاس کے لیے مشہور ہیں۔ مگر مانک دا کے پرانے ساتھی اور دوست آرٹ ڈائریکٹر بنسی چندر گپت

اور شبانہ کی نظر میں کیفی اعظمی کے علاوہ کوئی دوسرا اس فلم کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ امیدواروں میں ایک نام اور بھی تھا۔ اختر الایمان کا۔ ان کا نام شاید امجد خان نے تجویز کیا تھا جو واجد علی شاہ کا کردار ادا کر رہے تھے اور اختر صاحب کے داماد تھے۔

مانک دا کے سامنے سارے نام رکھے گئے، کافی مباحثے ہوئے مگر ان کی رائے سب سے الگ تھی۔ انھوں نے کہا بیدی صاحب اور گلزار صاحب بہت اچھا لکھتے ہیں مگر پنجابی ہیں اور فلم کا پس منظر لکھنؤ ہے جسے وہ نہیں جانتے۔ اختر الایمان اس لیے قابل قبول نہیں تھے کہ مانک دا کو بی۔ آر چوپڑہ کی فلموں جیسے مکالمے نہیں چاہیے تھے۔ لے دے کے رہ جاتے تھے کیفی صاحب۔ اردو دنیا کا بڑا نام، شمالی ہند کے رہنے والے اور ہیر رانجھا اور گرم ہوا جیسی فلموں کی مکالمہ نگاری کا تجربہ بھی رکھتے تھے۔

فیصلہ ہوا کہ ''شطرنج کے کھلاڑی'' کے ڈائیلاگ کیفی صاحب لکھیں گے۔ چناں چہ ایک ملاقات کا بندوبست کیا گیا۔ مگر وہ ملاقات جسے فلم اور ادب کا سنگ میل بننا تھا بری طرح فلاپ ہوگئی کیوں کہ اس میں ''زبان یار من ترکی، و من ترکی نمی دانم'' والی صورت حال پیدا ہوگئی۔ کیفی صاحب نے ساری زندگی اردو کے علاوہ کسی اور زبان کو منہ نہیں لگایا تھا اور ستیہ جیت بابو بنگلہ اور انگلش کے علاوہ کوئی اور زبان نہ بول سکتے تھے نہ سمجھ سکتے تھے۔ اس ٹیڑھے مسئلے کے بہت سے حل سوچے گئے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ شبانہ ترجمان کا کام کریں۔ وہ اپنے ابا کے لیے یہ تکلیف سہنے کو تیار بھی تھیں مگر رے صاحب کا کہنا تھا کہ رائٹر اور ڈائریکٹر کا رشتہ میاں بیوی کے رشتے جیسا ہوتا ہے اور یہ بلا شرکت غیرے ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا:

''مجھے کوئی نام والا ادبی یا فلمی رائٹر نہیں چاہیے۔ نیا آدمی بھی چلے گا بس اسے زبان آنی چاہیے......!''

اور یہی وہ موقع تھا جب شمع نے میرا نام لیا اور بہت سے لوگوں کے ناک سکوڑنے اور شمع کی ناسمجھی پر اعتراض کرنے کے باوجود ستیہ جیت رے نے مجھ سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یہ تو پس منظر تھا۔ پیش منظر یہ تھا کہ ہم دونوں نے آٹھ ہی دن میں سارے ڈائیلاگ لکھ ڈالے

اور ایک دوسرے کی خوب کمر ٹھونکی مگر دل ڈر رہا تھا کیوں کہ اصلی امتحان تو باقی تھا۔ مانک دا کے سامنے پیشی...... کوئی 9 دن بعد وہ تہران سے لوٹے تو فون کیا:

''تم نے اسکرپٹ پڑھ لیا؟''

''پڑھ لیا؟...... سر ہم نے تو لکھ لیا......!'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

فون پر ان کی ہنسی سنائی دی:

Really?---that's my speed young man---!

طے پایا کہ دو دن بعد ہم ملیں گے اور اسکرپٹ سنایا جائے گا۔ دو دن بعد میں اور شمع ہوٹل پریزیڈنٹ پہنچے تو حیران رہ گئے۔

کمرے میں جلسہ جما ہوا تھا۔ فرش کے اوپر دیوار سے کمر ٹکائے کوئی آدھے درجن بزرگ تشریف فرما تھے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو میں جانتا تھا۔ کچھ صورت آشنا تھے۔ پروفیسر نظام الدین گوریکر سینٹ زیویئر کے اردو فارسی ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے۔ ایک صاحب انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نگراں تھے۔ ایک اور بزرگ ایک ادبی رسالے کے ایڈیٹر تھے، باقی حضرات بھی کچھ اسی قبیل کے تھے۔ اردو کے ان ماہرین کی صورت دیکھتے ہی سمجھ میں آگیا کہ ان لوگوں کو میری اور شمع کی قابلیت جانچنے کے لیے بلایا گیا ہے۔ مانک دا بیڈ پر بیٹھے تھے اور ان کے پاس ہی سریش جندل اور بنسی چندر گپت براجمان تھے۔

مجھ سے جرنلزم چھوٹ چکا تھا مگر اس کی عادتیں نہیں چھوٹی تھیں۔ یہ بری عادت اب تک ہے کہ کسی سے ڈرتا نہیں ہوں۔ اچھا صحافی وہی ہوتا ہے جو امیروں وزیروں تک کو خاطر میں نہیں لاتا اور خطروں میں بے خطر کود پڑتا ہے۔ میں نے بھی ایک کونا پکڑا۔ فائل کھول کر اس طرح سامنے رکھا جیسے میلاد پڑھنے کا ارادہ ہو۔ شمع میرے برابر بیٹھ گئیں۔ میں نے ایک بار مانک دا کی طرف دیکھا جن کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے بچے کو منہ مانگا کھلونا ملنے والا ہو اور چشمے کی ٹانگ منہ میں تھی۔

میں نے پہلے سین سے لے کر آخری ڈائیلاگ تک پورا اسکرپٹ اس طرح سنایا کہ گلا گیلا

کرنے کے لیے بھی نہیں رکا۔کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد جب فائل بند ہوئی تو کمرے میں عجیب طرح کا سناٹا تھا۔حاضرین کی سوچتی تولتی آنکھیں میرے اور شمع کے اوپر جمی ہوئی تھیں۔تھوڑی دیر بعد سب سے پہلی آواز مانک دا کی سنائی دی۔ایک ہلکی سی ہنسی کے ساتھ انھوں نے کہا:

I don't know what he has written, but it's sounds good...

(معلوم نہیں اس نے کیا لکھا ہے مگر سننے میں اچھا لگ رہا ہے)

کچھ بزرگوں نے تبصرہ اور کچھ نے سوال کیے۔بنسی چندر گپت نے جو بہت اچھی اردو جانتے اور بولتے تھے پوچھا:

"آپ نے ایک جگہ لکھا ہے، تڑکے چلیں گے جھٹ پٹے میں لوٹ آئیں گے۔کیا لوگ اسے سمجھ پائیں گے؟"

میں نے عرض کیا:

"کہنا یہ ہے کہ صبح کو چلیں گے شام کو لوٹ آئیں گے۔اس ڈائیلاگ میں صبح شام بھی استعمال ہو سکتے تھے۔یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ سویرے چلیں گے رات کو لوٹ آئیں گے۔لیکن تڑکے اور جھٹ پٹے اس لیے استعمال کیا ہے کہ اس زمانے کی زبان کا محاورہ سنائی دے سکے۔کان کو ذرا سا اجنبی لگتا ہے مگر اچھا لگتا ہے اور مطلب تو سمجھ میں آ ہی جاتا ہے۔"

مختصر یہ کہ میں اور شمع بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو گئے۔سریش جندل نے بھی طرح طرح سے اطمینان کرنے کے بعد صبر و شکر سے کام لیا اور دو تازہ واردان بساط ہوائے فلم کو قبول کر لیا۔اور مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ میں نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کے لیے عزت و شہرت کے علاوہ مبلغ پندرہ ہزار روپے بھی ملیں گے۔شمع چوں کہ فلم کے Costumes بھی کر رہی تھیں اس لیے ان کا معاوضہ کیا تھا مجھے معلوم نہیں۔

اسکرپٹ ملنے کے بعد مانک دا کی پہلی فرمائش یہ تھی کہ مکالموں کا حرف بہ حرف ترجمہ انگلش میں کیا جائے اور ان کو بھیجا جائے تاکہ انھیں اندازہ ہو سکے کہ ہم لوگ ان کے اسکرین پلے

سے کتنے دور یا قریب ہیں۔ یہ کام شمع نے فوراً کر دیا۔ ان کی انگلش ماشاء اللہ میری اردو سے بھی اچھی ہے۔

اس کے بعد میری باری آئی۔ مانک دا اُردو مکالموں کا ایک ایک لفظ بنگلہ رسم الخط میں لکھتے اور پھر بول کر دیکھتے۔ میں نے وجہ پوچھی تو فرمایا:

''زبان کوئی بھی ہو، لفظوں کی اپنی موسیقی ہوتی ہے۔ یہ موسیقی صحیح ہونی چاہیے۔ اگر ایک سر غلط لگ جائے تو پورا سین بے معنی ہو جاتا ہے!'' (اے سبحان اللہ!)

یہاں تک سب خیریت تھی کہ اچانک مانک دا نے کلکتہ سے فون کیا اور بولے:

''تمہارے ڈائیلاگ میری سمجھ میں تو آ گئے مگر ایکٹروں کو کون سمجھائے گا کہ انھیں بولنا کیسے ہے؟''

مسئلہ ٹیڑھا تھا۔ میں پریشان ہونے لگا تو انھوں نے حل بھی نکال دیا:

''تم کوئی دوسرا کام نہیں کر رہے ہو تو ڈائیلاگ ڈائریکشن بھی سنبھال لو......!''

میں نے سوچنے کی مہلت مانگی مگر دوسرے دن پروڈیوسر نے بتایا کہ ڈائیلاگ ڈائریکشن کے مزید پندرہ ہزار روپے ملیں گے تو نہ کہنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں بچی اور میں کلکتہ پہنچ گیا اور مانک دا کے سلام کو حاضر ہوا۔

مانک دا بشپ لفرائے روڈ پر ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ لکڑی کے اونچے دروازے سے گھر کے اندر آؤ تو ایک ہال جیسا تھا، جس میں کچھ صوفے، کچھ کرسیاں، کتابوں کی الماری، شلف پر کچھ ٹرافیاں اور ایک پیانو آنکھوں کا استقبال کرتا تھا۔ کمرے کے آخری سرے پر بڑی بڑی کھڑکیوں کے پاس جو سڑک کی طرف کھلتی تھی، مانک دا ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے تھے۔ عام طور پر گھٹنا ٹیڑھا کر کے اس پر رائٹنگ پیڈ رکھ لیا کرتے تھے اور قلم فراٹے بھرتا ہوتا تھا۔

گھر کی ہر چیز میں سلیقہ اور نفاست دکھائی دیتی تھی۔ میرا خیال ہے اس خوش مذاقی کی

ذمہ دار مانک دا سے کہیں زیادہ ”بودی“ (بھو دیدی) یعنی مسز بجو یارے تھیں۔ بڑی ہی پیاری اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ جب بھی ملتی تھیں ایک بے حد معصوم مسکراہٹ چہرے پر پھیل جاتی اور ہاتھ تو اتنے پیار سے پھیلتے تھے کہ بے ساختہ گلے لگ جانے کو جی چاہتا تھا۔

ستیہ جیت رے کو ستیہ جیت رے بنانے میں بودی کی بے لوث محبت اور اپنے مانک کی صلاحیت پر یقین نے بے مثال کردار ادا کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پاتھر پنچالی آدھے میں ہی بند ہوگئی تھی کیوں کہ پیسے ختم ہو گئے تھے۔ اس وقت بودی نے اپنے سارے زیور گروی رکھ کر کہا تھا:

”زیور تو جب چاہو بن سکتے ہیں۔ پاتھر پنچالی بار بار نہیں بن سکتی......!“

کلکتہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ پہلے بھی کئی بار آچکا تھا مگر وہ شہر مجھے کبھی پسند نہیں آیا۔ جدھر دیکھو ایک بے ترتیب ہجوم دکھائی دیتا تھا۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے کوئی پرانا پتھر ہٹایا ہو اور نیچے سے لاکھوں چیونٹیاں بلبلا کے باہر نکل آئی ہوں۔ اب اسے وقت کی ستم ظریفی ہی کہیے کہ کچھ دن بعد چیونٹیوں کے اس بے ترتیب ہجوم میں میں اور شمع بھی شامل ہو گئے۔

ہوا یوں کہ کلکتہ پہنچ کر اسٹوڈیو میں قدم رکھا تو ایک عجیب منظر نظر آیا۔ آرٹ ڈپارٹمنٹ کے لوگ اور مانک دا کے کچھ اسسٹنٹ میر اور مرزا کے گھروں کے لیے پراپرٹی جمع کر رہے تھے۔ اور سخت پریشان تھے کیوں کہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ جو سامان اکٹھا کیا گیا ہے وہ غلط ہے یا صحیح۔ ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کبھی لکھنؤ دیکھا بھی نہ ہو ہزار میل دور بیٹھ کر ڈیڑھ سو برس پرانی تہذیب کو زندہ کرنا چراغ میں سے جن نکالنے کے برابر تھا۔ سامان سب تھا مگر زیادہ تر غلط تھا۔ مثال کے طور پر پانی کے لیے مٹی کے برتن منگا لیے گئے تھے مگر وہ گھڑے نہیں تھے، بڑے منہ والے مٹکے تھے۔ یوپی کے گھڑے اتنے چھوٹے منہ کے ہوتے ہیں کہ ہاتھ پھنس جاتا ہے۔ میں نے سوچا ڈائیلاگ ڈائریکشن تو تب ہوگی جب شوٹنگ شروع ہوگی۔ ابھی تو اندر پوری اسٹوڈیوز میں لکھنؤ بنانے کا کام شروع کر دینا چاہیے۔ چناں چہ میں نے آستین چڑھائی اور حملہ بول دیا۔ گھڑے تو مل گئے۔ ان کو رکھنے کے لیے لکڑی کی گھڑونچی بنوائی۔ منہ پر باندھنے کے لیے لال کپڑا منگوایا مگر تانبے یا چاندی کے نقشیں کٹورے کہیں نہیں ملے۔ مانک دا اسٹوڈیو

آئے اور مجھے مٹی کے تیل اور کوئلے کی راکھ سے برتنوں کو چمکاتے دیکھا تو ہنس پڑے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

انھوں نے پوچھا:

"میں بے کار نہیں بیٹھ سکتا سر!"

میں نے جواب دیا۔

انھوں نے میرا کندھا تھپ تھپایا اور بولے:

"اسپیشل پراپرٹی کی لسٹ شمع کے پاس ہے، تم چاہو تو شمع کی مدد کر سکتے ہو......!"

چناں چہ، ہم دونوں نے کلکتہ کے گلی کوچوں کی خاک چھاننا شروع کر دی۔

جس زمانے میں شمع اور میں فلم کے لیے سامان جمع کرتے گھوم رہے تھے، مانک دا کے نام کا وہی اثر ہوتا تھا جو کسی منتر کا ہوتا ہے۔ ہر دروازہ کھل جاتا تھا اور دیدہ و دل فرش راہ ہو جاتے تھے۔ بنگال کے پرانے رئیس اپنی عالی شان حویلیوں میں گزری ہوئی عظمت کی ایسی ایسی نایاب نشانیاں چھپائے بیٹھے تھے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ اپنی تہذیب کو بچانے اور بچائے رکھنے کا کام جیسا شمالی ہند والوں نے کیا ویسا کہیں نہیں ہوا مگر کلکتہ پہنچ کر اندازہ ہوا کہ بنگال کسی طور سے پیچھے نہیں بلکہ کچھ آگے ہی ہے۔ وہاں کیسے کیسے شوقین رئیس تھے اس کا اندازہ صرف ایک مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔

ہمیں ایک قلم دان کی ضرورت تھی۔ پتا چلا کہ ایک بنگالی رئیس ہیں جو بندوقیں بیچتے ہیں مگر نایاب چیزیں جمع کرنے کے شوقین بھی ہیں۔ ستیہ جیت رے کا نام سنا تو خود اپنی "باری" (حویلی) پر لے کر گئے اور اپنے خزانے کا دروازہ کھول دیا۔ دیگر نوادرات کا ذکر تو جانے دیجیے، قلمدانوں، قلموں اور دواتوں کا ذخیرہ دیکھ کر آنکھیں اس طرح کھلیں کہ جھپکنا بھول گئیں۔ چاندی سے لے کر ہاتھی دانت اور صندل کے قلم دان تھے۔ پَر کے قلم سے لے کر نیزے اور نب والے ہولڈر بھی تھے اور دواتیں تو اللہ کی پناہ اتنی تھیں کہ حساب کرنے میں سیاہی کم پڑ جائے،

سونے چاندی اور کانچ سے لے کر لکڑی اور مٹی کی دواتیں ہر سائز اور ہر ڈیزائن میں موجود تھیں۔

مجھے ایک دوات آج تک یاد ہے۔ شیشے کو تراش کے کمرکھ کی شکل دی گئی تھی۔ خالی دیکھو تو آر پار بالکل شفاف دکھائی دیتی تھی مگر روشنائی ڈالو تو پنج تن پاک کے نام نظر آنے لگتے تھے۔ ان کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ ہر آدمی دیدہ و دل فرش راہ کر دیا کرتا تھا۔ فلم کے آخری سین میں جب مرزا امیر پر گولی چلاتا ہے اور گولی شال کو چھوتی ہوئی نکل جاتی ہے اس میں جو شال استعمال کی گئی ہے وہ ایک بے حد قیمتی کشمیری شال ہے جس کی قیمت اس زمانے میں تیس چالیس ہزار روپے تھی۔ مگر مانک دا کی محبت میں اس شال کے مالک سیٹھ کیجری وال گولی کا نشان دکھانے کے لیے اس شال میں سوراخ کیے جانے پر بھی آمادہ ہو گئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اس سوراخ کو رفو کر دیا گیا اور شال پہ کوئی نشان بھی نہ رہا، لیکن کیجری وال کی عقیدت کا نشان آج بھی باقی ہے۔ میں اور یونٹ کے دوسرے لوگ سوا نو بجے تک اندر پوری اسٹوڈیو پہنچ جاتے۔ ساڑھے نو بجے مانک دا آتے اور آتے ہی پہلا کام یہ ہوتا کہ اس دن جو سین شوٹ ہونے والا ہوتا اس کے نوک پلک سنوارے جاتے......!

اسٹوڈیو کے آخری کونے میں پیپل کا ایک گھنا، سایہ دار پیڑ تھا جس سے اس طرف دھوپ نہیں آتی تھی اور وہ کونا ٹھنڈا رہتا تھا۔ پیپل کی چھاؤں میں نازک نازک شاخوں والے انار کی جھاڑیاں سی بن گئی تھیں اور اس کے نیچے سفید پتھر کی ایک بنچ تھی۔ یہ جگہ مانک دا کو بہت پسند تھی۔ ان کا روز کا معمول تھا کہ وہ پتھر پر اپنا اسکرپٹ لے کر بیٹھ جاتے اور میں اپنا فائل کھول لیتا۔ پہلے وہ اپنا اسکرین پلے پڑھتے۔ پھر مجھ سے ڈائیلاگ سنتے۔ کبھی کوئی لفظ یا لائن بدلنی ہوتی تو بدلواتے۔ سر ٹیڑھا کر کے دیر تک سوچتے رہتے پھر اپنا اسکرپٹ بغل میں دبا کے کھڑے ہوتے اور زور سے بولتے:

"Let's start...!"

اور سیٹ پر چلے جاتے......!

مانک دا کا اسکرپٹ بھی ان کی شخصیت کی طرح ایک الگ ہی چیز تھی۔ یہ ایک بہت موٹا

سا کھاتا تھا۔ جیسا پرانے زمانے کے بنیوں کے پاس ہوا کرتا تھا۔ فل سائز کے چکنے بادامی کاغذ اور لال رنگ کے کپڑے کی جلد......! وہ خود بھی اسے "کھاتا" ہی کہا کرتے تھے۔ اس کھاتے میں فلم کا ہر سین انگلش اور بنگلہ رسم الخط میں اردو ڈائیلاگ کے ساتھ لکھا ہوتا تھا۔ پورے سین کا Shot Division ہوتا تھا اور ہر شاٹ کا ایک اسکیچ بنا ہوا ہوتا تھا جسے دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا کہ سیٹ کے کس حصے میں شوٹنگ ہوگی، آرٹسٹ کی پوزیشن کیا ہوگی۔ چوں کہ مانک دا بہت اچھے پینٹر بھی تھے اس لیے اسکیچ دیکھتے ہوئے ایسا لگتا تھا جیسے فلم کا فریم دیکھ رہا ہوں۔ سین کو اس طرح ایک ایک فریم کے اسکیچ میں بانٹنا آج کل تو بہت عام ہو گیا ہے اور اسے اسٹوری بورڈ کہا جاتا ہے مگر اس وقت میرے لیے بالکل ہی نئی تکنیک تھی۔

مانک دا نے دنیا کی فلم انڈسٹری میں اپنے لیے ایک الگ مقام بنایا تھا۔ ان کی شخصیت بھی دوسروں سے مختلف تھی مگر ان میں اور بھی ایسی بہت سی باتیں تھیں جو انھیں ایک منفرد حیثیت دیتی ہیں۔ پتا نہیں یہ عادتیں ان کے مزاج کا حصہ تھیں یا انھوں نے کسی وجہ سے اختیار کر لی تھیں۔ مگر تھیں بہت دلچسپ اور مانک دا کے کردار کو ایک نیا زاویہ مہیا کرتی ہیں۔

عام طور پر فلم ڈائریکٹرز شوٹنگ کے دوران اپنے سیٹ یا لوکیشن پر بھیڑ بھاڑ سے بہت گھبراتے ہیں مگر مانک دا کا حساب بالکل الٹا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ "شطرنج کے کھلاڑی" کی شوٹنگ کے دوران اندر پوری اسٹوڈیو کے فلور پر شوٹنگ دیکھنے والوں کی تعداد ڈیڑھ دو سو آدمیوں سے کبھی بھی کم رہی ہو۔ اور ایسا نہیں ہے کہ دیکھنے والے زبردستی گھس آئے ہوں اور انھیں نکالنا ممکن نہ ہو۔ جی نہیں، سیٹ پر Visitors کے لیے باقاعدہ بندوبست کیا جاتا تھا۔ دیکھنے والے ورکنگ ایریا میں نہ آئیں اس لیے رسیاں باندھ دی جاتی تھیں اور معزز مہمانوں کے لیے کرسیوں کا بندوبست ہوتا تھا۔

حیرت اس پر ہوتی تھی کہ اتنی بھیڑ ہونے کے باوجود سارا کام اسی طرح ہوتا تھا جس طرح ہونا چاہیے۔ عوام کا ہجوم اس طرح چپ چاپ کھڑا رہتا تھا جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو۔ سیٹ یا لوکیشن پر کبھی کوئی شور غل نہیں ہوتا تھا۔ میں نے مانک دا کو کبھی آواز اونچی کرتے

نہیں سنا۔ وہ اداکاروں کو ہدایات بھی اس طرح دیتے تھے کہ اکثر مجھے بھی جو بالکل پاس ہی کھڑا ہوتا تھا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ وہ چاہے کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں اگر ایکٹر کی پوزیشن بھی تبدیل کرنی ہوتو اشارے سے یا چلا کر کبھی کچھ نہیں کہتے تھے۔ بلکہ چل کر پاس آتے تھے اور جو سمجھانا ہوتا تھا وہ سمجھا کر لوٹ جاتے تھے۔

ایک دفعہ تو ایسا ہوا کہ مانک دا کرین کے اوپر بیٹھے تھے۔ نیچے محرم کا جلوس نکل رہا تھا جس میں امجد خان تاشا بجا رہا تھا۔ اچانک آواز آئی: CUT...... سب لوگ رک گئے۔ کرین نیچے آیا۔ مانک دا اترے۔ امجد کے پاس گئے، اس سے کچھ کہا اور واپس کرین پر جا بیٹھے۔ آپ کو معلوم ہے وہ اتنے اوپر سے نیچے کیا کہنے آئے تھے۔ انھوں نے کہا:

"جب تھوڑا آگے آجاؤ تو تاشا بجاتے بجاتے سر اوپر کر لینا......!"

ان کی ایک اور عجیب ادا تھی کہ ایک دفعہ سیٹ پر چلے جائیں تو شام کو PACK UP بولنے سے پہلے باہر نہیں آتے تھے۔ لنچ بریک میں جب لائٹ مین، اسپاٹ بوائے اور پروڈکشن والے بھی باہر چلے جاتے اور ویران فلور بھائیں بھائیں کرنے لگتا تو بھی مانک دا بیٹھے رہتے۔ ان کے زانوں پر ان کا کھاتا ہوتا، آنکھیں کاغذ پر ہوتیں اور ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے میں سینڈوچ۔ ان کا کھانا بھی کمال ہی تھا۔ آٹھ گھنٹے کی شفٹ میں صرف ایک چکن سینڈوچ اور ایک کلہڑ "مشٹی دوہی" (میٹھا دہی) بس...... اور منہ کا مزہ بدلنے کے لیے ایک سگریٹ......! مانک دا ہرفن مولا تھے اور فنون کی فہرست اتنی طویل تھی کہ پڑھنے کے بعد حیرت پوچھتی تھی:

"مولا! یہ چیز کیا ہیں؟"

وہ ڈائریکٹر تھے، رائٹر تھے اور فلموں کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھتے تھے خاص طور سے بچوں کے لیے۔ پینٹر تھے، کارٹونسٹ تھے، اخباروں کے لیے معمے ترتیب دیتے تھے۔ موسیقی میں خاصی مشق تھی، پیانو بہت اچھا بجاتے تھے اور اپنی فلموں کا میوزک زیادہ تر خود ہی دیا کرتے تھے۔ بیک گراؤنڈ میوزک تو ہمیشہ خود ہی Compose کرتے تھے۔ شوٹنگ کے وقت لائٹ تو

ڈائریکٹر آف فوٹوگرافی کرتا تھا مگر کیمرہ خود سنبھالتے تھے۔ شاٹ چاہے کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو کیمرہ مین کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اپنی آنکھ سے دیکھنے اور دوسرے کی نظر سے دیکھنے میں فرق ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اکثر چلتے Take میں شاٹ بدل دیا کرتے تھے۔ چوں کہ ایڈیٹنگ بھی خود ہی کرتے تھے اس لیے Taking بھی اسی حساب سے کرتے تھے۔ صرف ایک ڈپارٹمنٹ ایسا تھا جس میں وہ کبھی دخل نہیں دیتے تھے اور وہ تھا آرٹ ڈپارٹمنٹ......! اس کی وجہ تھے آرٹ ڈائریکٹر بنسی چندرگپت جو مانک دا کے پرانے ساتھی اور دوست بھی تھے اور اپنے فن میں اپنی مثال آپ تھے۔ سیدھے لفظوں میں کہنا ہو تو کہا جائے گا کہ مانک دا ایک مکمل ڈائریکٹر تھے۔ اور مکمل ڈائریکٹر وہ ہوتا ہے۔ جو اسکرپٹ سے اسکرین تک کی ہر منزل کو جانتا ہی نہیں انھیں سر کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان کی فلمیں عوام کے بارے میں ہوتی تھیں لیکن عوام سے زیادہ خواص پسند کرتے تھے۔ مگر وہ خود عوام میں بے حد مقبول تھے۔

''شطرنج کے کھلاڑی'' میں مجرا کرنے کے لیے ایک کمسن رقاصہ کی تلاش تھی۔ (بعد میں یہ کردار ''شاس وتی سین'' نے ادا کیا)۔ پتا چلا کہ سوناگاچھی میں ایک لڑکی ہے۔ جو بہت اچھا ڈانس کرتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مانک دا اسے بلوا لیتے۔ وہ بھی سر کے بل آجاتی مگر اس خیال سے کہ نئی جگہ پر گھبرا نہ جائے۔ مانک دا نے فیصلہ کیا کہ وہ خود جائیں گے۔ اس بازار حسن کی پتلی پتلی گلیوں میں گاڑی نہیں جا سکتی تھی اس لیے بڑی سڑک پر ہی اتر گئے اور چل پڑے گوہر مقصود کی تلاش میں......!

آگے آگے لپکتے ہوئے پروڈکشن منیجر بھانو دا، اس کے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے مانک دا اور قدم سے قدم ملانے کی کوشش کرتا ہوا میں۔ راستے میں جس نے بھی دیکھا یا تو رک گیا یا پلٹ کر دیکھنے لگا۔

مانک دا نے کوٹھے پر پہنچ کر لڑکی کا مجرا دیکھا۔ کچھ ادھر ادھر کی باتیں کیں اور جب ہم لوگ واپس جانے کے لیے نیچے اترے تو وہ گلی بلکہ آس پاس کی گلیاں بھی اپنے ستیہ جیت بابو

کو ایک نظر دیکھ لینے والوں سے بھر چکی تھیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مانک دا کو دیکھ کر لوگ ان پر اس طرح نہیں ٹوٹے جیسا عام طور پر فلم والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ بلکہ ہجوم ادب سے ہٹ کر راستہ دیتا گیا اور وہ نکلتے چلے گئے۔

کتابوں میں پڑھا ہے کہ ارجن کی آنکھ پتیوں میں چھپی ہوئی چڑیا کو دیکھ لیا کرتی تھی۔ مانک دا کی آنکھ بھی کچھ کم نہیں تھی۔ آرٹسٹ ہو یا ٹیکنیشین وہ نہ جانے کیسے اندر چھپا ہوا Talent دیکھ لیا کرتے تھے۔ وہ بھی ایک نظر میں!...... ان کی اس انوکھی صلاحیت کی درجنوں مثالیں ابھی تک موجود ہیں۔

اپنا قصہ تو میں سنا ہی چکا ہوں۔ سعید جعفری کا واقعہ بھی سن لیجیے۔ سعید لندن میں رہتے تھے۔ بی بی سی پر کام کرتے تھے۔ کچھ برٹش اور کچھ امریکی فلمیں بھی کر چکے تھے۔ ایک دن بیروت کے ہوائی اڈے پر اپنی فلائٹ کا انتظار کر رہے تھے کہ مانک دا پر نظر پڑی جو دہلی جا رہے تھے۔ سعید نے اپنا تعارف کرایا اور باتیں کرنے لگے۔ اچانک مانک دا نے کہا:

"سعید تم میری فلم میں کام کرو گے؟"

اس وقت تک سعید جعفری ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی ہندوستان کی فلم انڈسٹری سے اتنے ہی ناواقف تھے جتنا ہندوستان ان سے انجان تھا۔

فلم اور وہ بھی ستیہ جیت رے کی فلم...... نہ کہنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ سعید نے جوش میں مانک دا کے ہاتھ چوم لیے اور خوشی سے جھومتے ہوئے اپنے ایئر کرافٹ کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے......!

امجد خان سے تو وہ ملے بھی نہیں، شعلے میں دیکھا تو دوسرے دن امجد کا Sketch بنایا۔ گالوں پر زلفیں لہرائیں، گلے اور کانوں میں ہیرے پہنائے اور سر پر زرکار دو پلی ٹوپی لگا دی تو یہ کہنے کے لیے ایک ہی نگاہ کافی تھی:

"ارے یہ تو جان عالم واجد علی شاہ اختر کا پورٹریٹ ہے۔"

شرمیلا ٹیگور، اپرنا سین اور شومترو چٹرجی کو اندھیرے سے نکال کر ستاروں میں بٹھانے کا کام بھی

مانک دا ہی نے کیا تھا۔

عظیم آرٹ ڈائریکٹر بنسی چندر گپت سری نگر سے کلکتہ آئے تھے کہ پینٹنگ سیکھیں گے مگر ٹکرا گئے ستیہ جیت رے سے جنھوں نے بنسی دا کو پاتھر پنچالی کا سیٹ ڈیزائن کرنے کا کام سونپ دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تاریخ ہے۔

بے مثال کیمرہ مین سبرتو مترا جنھوں نے دنیا کو Bounce Light جیسی تکنیک سکھائی مانک دا ہی کی کھوج تھے۔ کتنی انوکھی بات ہے کہ جس آدمی نے کبھی کیمرہ نہ سنبھالا ہو اسے کیمرہ مین بنا دیا جائے مگر یہی تو وہ صلاحیت ہے، جسے مانک دا کی تیسری آنکھ کہا جا سکتا ہے۔

چھوٹی چھوٹی معمولی باتیں جن پر کسی کا دھیان بھی نہ جاتا تھا ان کی تیسری آنکھ سے بچ کر نہیں جاتی تھیں۔ اسٹوڈیو میں میر روشن علی کے گھر کا سیٹ لگ رہا تھا۔ شوٹنگ سے پہلے دیکھنے آئے تو بنسی دا سے کہنے لگے دیواریں میلی ہونی چاہئیں۔ بنسی دا نے کہا ہو جائیں گی۔ مانک دا جاتے جاتے اچانک رکے اور وہ بالٹی اٹھا لی جس میں پینٹ برش نرم ہونے کے لیے بھگو دیے گئے تھے۔ انھوں نے برش میں بالٹی کا گندا پانی لیا اور دیواروں کو رنگنا شروع کر دیا۔ پھر اس بے رونق اور بے نور دیوار کو دیکھ کر بولے:

"یہ اترا ہوا رنگ ہی اصلی رنگ ہے۔ ایسا لگنا چاہیے جیسے برسوں سے کوئی رنگ روغن نہیں ہوا ہے......!"

اسی سیٹ کی بات ہے۔ کیمرہ مین شومندو رائے جنرل لائٹنگ کر چکے تھے۔ مانک دا نے لائٹنگ دیکھی، بہت دیر تک چاروں طرف دیکھتے رہے اور گھوڑے (لکڑی کا مچان) پر رکھے ہوئے بروٹ (پرانے زمانے کی دس کیلوواٹ کی لائٹ) کی طرف اشارہ کر کے شومندو سے کہا:

"اسے دو فٹ نیچے لے لو......!"

شومندو نے سر ہلایا اور بروٹ نیچے اتارنے میں لگ گئے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ بات کیا

ہوئی؟...... وہ لائٹ اس لیے لگائی گئی تھی کہ آنگن میں دھوپ آتی ہوئی دکھائی دے۔ اس میں دو فٹ اوپر یا نیچے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ رہا نہیں گیا تو میں نے پوچھ ہی لیا۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے کبھی کسی کو مانک دا سے کچھ پوچھتے نہیں دیکھا تھا مگر میرے اندر کا جرنلسٹ جسے سوال پر سوال کرنے کی عادت تھی کہاں رکنے والا تھا۔ میں نے پھر پوچھا تو وہ کچھ جھنجھلا گئے۔ میری آنکھوں میں دیکھ کر تیزی سے بولے:

''اسکرپٹ تم نے لکھا ہے تمھیں نہیں معلوم؟''

''جی لکھا تو ہے مگر یہ لائٹ......؟''

''یہ سین کہاں ہو رہا ہے؟''

''جی لکھنؤ میں......''

''موسم کیا ہے؟''

''جی سردیاں...... دسمبر جنوری''

''میرزا، میر کے گھر کس وقت آتا ہے؟''

''جی سویرے ہی آتے ہیں۔ 9 یا دس بجے......!''

''Exactly۔ لکھنؤ میں۔ سردیوں میں۔ صبح۔ دس بجے سورج نکلتا ہے۔

تو لائٹ کا اینگل کیا ہونا چاہیے؟''

انھوں نے میرے کندھے پر ایک ہلکی سی چپت لگائی اور سیٹ سے باہر چلے گئے۔ میں دل ہی دل میں سر پکڑ کے سوچنے لگا:

''ارے باپ رے۔ یہ آدمی ہے یا......''

ان کا کہنا تھا جن باتوں کو ہم نظر انداز کر دیتے ہیں وہی سب سے پہلے نظر میں آتی ہیں۔ عالم یہ تھا کہ ہم لوگ ہر Take سے پہلے میر اور مرزا کی شالوں کی سلوٹیں (Folds) بھی گنتے اور درست کرتے تھے تاکہ Continuity میں پریشانی نہ ہو۔

لکھنؤ کے پاس جس گاؤں میں کلائمکس کی شوٹنگ ہونی تھی وہاں دو دن پہلے منہ

اندھیرے پہنچ گئے۔ شومندو رائے، میں اور پروڈکشن کا ایک مقامی آدمی ساتھ میں تھے۔ ایک گاؤں والے سے چارپائی مانگی اور نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر روشنی کا سفر دیکھتے رہے اور اپنے کھاتے میں Notes لکھتے رہے۔ جب سورج ہمارے سروں پر سے گزرتا ہوا جھوپڑوں کے پیچھے جا چھپا تو اٹھے اور دن بھر کے مون برت کے بعد شومندو سے بنگلہ میں ایک جملہ کہا:

''Reflecters کی ضرورت ہوگی......!'' اور بس......!

پہلی دفعہ سمجھ میں آیا کہ آؤٹ ڈور میں گھٹتی بڑھتی دھوپ کا مزاج سمجھنا فلم کے لیے کتنا ضروری ہے۔ ان کی فن کاری، ہوشیاری اور باریک بینی کو دنیا جانتی ہے، مگر کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس بلند و بالا شخصیت کے اندر ایک معصوم بچہ بھی تھا۔ کسی بھولے بچے کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہونا۔ نئی نئی چیزوں پر حیران ہونا اور یہ جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں ان کے کردار کا ایک حصہ تھا۔

ایک رات وہ سین فلمایا جا رہا تھا جس میں شبانہ اعظمی غصے میں تیزی سے چلتی ہوئی برآمدے سے گزرتی ہیں اور میر و مرزا پر شطرنج کے مہرے اچھال دیتی ہیں۔ جس برآمدے سے شبانہ کو گزرنا تھا اس میں ٹرالی لگی ہوئی تھی اور کیمرے کو شبانہ کے ساتھ ساتھ چلنا تھا۔ کئی بار ریہرسل ہو چکی تھی۔ ٹرالی کی رفتار طے کی جا چکی تھی۔ بس Take کی دیر تھی کہ مانک دا کی آواز سنائی دی:

''جاوید......!''

''یس سر......؟''

انھوں نے حویلی کے آنگن کی طرف اشارہ کیا اور بولے:

''یہ بڑا ویران سا لگ رہا ہے۔ اس میں کوئی Break دے سکتے ہو۔ اگر لال رنگ کی کوئی چیز بیچ میں آجائے تو بہت اچھا لگے گا۔''

میں نے کہا:

''آپ کہیں تو الگنی باندھ کر اس پر کوئی لال چادر ڈال دوں......؟''

''یو پی کے آنگنوں میں اسی طرح کپڑے سکھائے جاتے ہیں......!''

''ہش......لال کپڑا تو بہت گندا لگے گا......!''

میں نے بہت سوچا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آرٹ ڈپارٹمنٹ والوں نے بھی ہاتھ کھڑے کر دیے۔ اچانک میرے ذہن میں بجلی کوندی۔ میں نے کہا:

''آگ......!''

فوراً ایک بڑا سا چولہا بنوایا گیا اس پر ایک برتن بھی رکھ دیا گیا اور چولہے میں آگ لگا دی گئی۔ جب سوکھی لکڑیوں سے اونچے اونچے سرخ شعلے اٹھے تو عالم دیکھنے کا تھا۔ مانک دا ٹرالی کے اوپر کھڑے ہو گئے اور چلانے لگے:

''جلدی آؤ۔ جلدی آؤ۔ دیکھو...... فریم کتنا خوبصورت بن گیا۔ ارے کیمرے میں سے دیکھو......!''

میں نے دیکھا، پس منظر کا منظر ہی بدل گیا تھا۔ وہ سین اسکرین پر چار سیکنڈ سے زیادہ نہیں رہتا اور شاید ہی کسی نے پس منظر میں جلتی ہوئی آگ پر غور کیا ہو۔ مگر میں مانک دا کی خوشی سے چمکتی ہوئی آنکھیں اور مسکراتے ہوئے ہونٹ کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ ایک معصوم بچے کا چہرہ تھا جسے انعام میں Cup مل گیا ہو۔ اپنی فلم کے ہر فریم کو ایک پینٹنگ بنا دینے کی کوشش ان کے بعد میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی......!

جہاں تعریف و توصیف ہوتی ہے وہاں تعریض بھی لازمی ہے۔ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔ مانک دا کو برا کہنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ ان پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ وہ دنیا کے سامنے اپنے ملک کی ایسی تصویر پیش کر رہے ہیں جس میں غریبی اور بدحالی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ نرگس دت نے تو پارلیامنٹ میں کہا تھا:

''ستیہ جیت رے کو بھوکا ننگا ہندوستان دکھانے کے بجائے اس آزاد ہندوستان کو دکھانا چاہیے جو ترقی کر رہا ہے۔''

یہ الگ بات ہے کہ سچائی آج بھی وہی ہے جو آدھی صدی پہلے تھی۔ مخالفین کی رائے تھی کہ

وہ دکھاوا بہت کرتے ہیں، وہ خود کو جتنا بڑا سمجھتے اور دنیا کو سمجھاتے ہیں اتنے بڑے ہیں نہیں......!

ایک مشہور بنگالی ڈائریکٹر نے زہریلی ہنسی کے ساتھ کہا تھا: ''پبلسٹی کی بھوک مٹتی ہی نہیں۔ ہر دو منٹ بعد Freeze ہو جاتا ہے تاکہ نمائے گھوش فوٹو لے سکے......!''

یہ نمائے گھوش بھی مزیدار شخصیت تھے۔ کافی موٹے اور کالے تھے اور آنکھوں پر اتنا بڑا چشمہ لگاتے تھے کہ فریم گال پر تک جاتا تھا۔ گلے میں ایک ڈبل لینز یاشیکا کیمرہ ڈالے ہر وقت مانک دا کے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے۔ جب بھی موقع ملتا اس طرح جھک جاتے جیسے بلی چوزہ پکڑنے کی تیاری میں ہو۔ پنجوں کے بل آگے بڑھتے اور فوٹو کلک کر کے اس طرح سیدھے ہوتے جیسے برجو مہاراج توڑا لیتے ہیں۔ اچھا فوٹو مل جائے تو چہرے پر مسکراہٹ دیکھنے کی ہوتی تھی۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے سچ مچ بلی کو چوزہ مل گیا ہو۔ نمائے گھوش کے پاس مانک دا کی تصویروں کا نایاب ذخیرہ ہے۔ دنیا میں شاید ہی کسی کے پاس کسی ایک آدمی کی اتنی تصویریں ہوں گی۔

لوگ جسے دکھاوا اور Show off سمجھتے تھے اس میں میڈیا کی کارستانی بھی شامل تھی۔ نقادوں، تبصرہ نگاروں اور چاہنے والوں نے اتنا لکھا اور ایسا ایسا لکھا کہ اکثر خود بے چارے ستیہ جیت رے بھی حیران ہو جایا کرتے تھے۔ ''اپور سنسار'' دیکھ کر ایک جرنلسٹ نے پوچھا:

''اس فلم میں اتنے بہت سے Tracking Shots ہیں جب کہ آپ کی پہلی فلم میں سب کے سب Fixed Shots تھے۔ آپ نے اپنا اسٹائل کیوں بدلا؟''

مانک دا نے جواب دیا:

''پاتھر پنچالی کے وقت میرے پاس Trolly نہیں تھی......!''

ایسا ہی قصہ ''ابھی جان'' کا ہے۔ جو ایک ٹیکسی ڈرائیور کی کہانی ہے۔ فلم کے پریس شو کے بعد ایک صحافی نے رے صاحب کی تعریفوں کے پل باندھ دیے:

''سر ایک ٹیکسی ڈرائیور کے ٹوٹے ہوئے Ego کو دکھانے کے لیے آپ
نے RVM (پیچھے دیکھنے کے لیے آئینہ) کو ٹوٹا ہوا دکھایا ہے۔ واہ واہ۔
یہ کمال آپ ہی دکھا سکتے ہیں......!''

ستیہ جیت رے نے حیرت سے جرنلسٹ کو دیکھا پھر آرٹ ڈائریکٹر بنسی چندر گپت سے پوچھا:

''بنسی کیا وہ کانچ ٹوٹا ہوا تھا؟''

مانک دا یہ قصہ سنا کر خوب ہنسا کرتے تھے۔

بڑھا ہی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لیے

اچھی بات یہ تھی کہ اپنے بارے میں لکھی گئی داستانوں پر خود انھوں نے کبھی اعتبار نہیں کیا۔ میں نے تو ان کے پیر ہمیشہ زمین پر ہی دیکھے۔

میرے پاس مانک دا کی چھوٹی بڑی یادوں کی ایک پوری کتاب ہے۔ جس میں سیکڑوں لمحے سوکھے ہوئے پھولوں کی طرح رکھے ہوئے ہیں۔ جب کبھی شمع یا نریندر سنگھ (ساؤنڈ ریکارڈسٹ) مل جاتے ہیں تو یادوں کی پرانی کتاب کھل جاتی ہے اور ہم تینوں اس کلکتہ کو یاد کرتے ہیں۔ جس نے ہماری زندگیوں پر اپنے گہرے نشان چھوڑے ہیں۔

شطرنج کے کھلاڑی ۱۹۷۷ء میں ریلیز ہوئی۔ میں اس وقت شہر میں نہیں تھا۔ مانک دا نے برٹش فلم ڈائریکٹر جیمس آئیوری کو میرا نام بطور چیف اسسٹنٹ ڈائریکٹر تجویز کیا تھا۔ شطرنج کی ریلیز کے وقت میں جودھ پور میں مرچنٹ آئیوری پروڈکشنز کی فلم ''ہلا بلو'' کی شوٹنگ کر رہا تھا۔ کوئی تین مہینے بعد واپسی ہوئی تو دوڑا ہوا ریگل سنیما پہنچا مگر پتہ چلا کہ فلم پسند نہیں کی گئی اور چار ہی ہفتے میں اتار لی گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ اب تک یہی فلم چار گنا منافع کما چکی ہے۔

ریلیز کے کئی سال بعد جب وہ بمبئی آئے تو میں سلام کو گیا۔ بہت محبت سے ملے، دیر تک بمبئی کی فلمی دنیا اور میری کوششوں کی کہانی سنتے رہے۔

میں نے پوچھا کوئی ہندی اردو فلم پلان نہیں کر رہے ہیں؟...... کہنے لگے:

"داراشکوہ" بنانا چاہتا ہوں......"

میں نے کہا:

"داراشکوہ میں ہم لوگ ہوں گے یا نہیں؟"

بہت زور سے ہنسے اور بولے:

"اگر تم نہیں ہوگے تو فلم کیسے بنے گی؟"

وہ میری اور ان کی آخری ملاقات تھی۔ آج ایک زمانہ گزر چکا ہے مگر مانک دا کا وہ جملہ میری یادوں میں سونے کے تمغے کی طرح جگمگاتا رہتا ہے......!

۱۹۸۳ء میں "گھورے باہیرے" کی شوٹنگ کر رہے تھے کہ دل کا دورہ پڑا۔ اور ان کی سرگرمیاں بے حد کم ہو گئیں۔ مگر ہمت والے آدمی تھے اور فلم بنانا ان کا شوق نہیں زندگی تھا اس لیے ذرا سے سنبھلے تو پھر وہی کاروبار شوق شروع ہو گیا۔ اسی زمانے میں ایک سال گرہ پر مبارک باد کے لیے فون کیا تو آواز میں وہ پرانا بانک پن نہیں تھا۔ میں نے کہا:

"آپ کو دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے......!" کہنے لگے:

"کلکتہ آجاؤ......!" میں نے کہا:

"میں تیار ہوں آپ داراشکوہ شروع کر دیجیے......!"

کچھ دیر چپ رہے پھر بولے:

"بہت مشکل ہے جاوید۔ اتنے بڑے پروجیکٹ کو بہت محنت چاہیے۔ طبیعت ذرا اور بہتر ہو جائے تو سوچوں گا......!"

اس کے بعد ان کی آواز سننے کا موقع کبھی نہیں ملا۔ پتہ نہیں کس کی آواز تھی جس نے ۲۳ر اپریل ۱۹۹۲ء کو فون پر کہا تھا:

"تمہارے مانک دا چلے گئے جاوید......!"

☆☆☆

بی حضور

میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر حوریں بوڑھی ہو جائیں تو بالکل میری نانی جیسی نظر آئیں گی..... میں نے جوانی تو دیکھی نہیں مگر ان کا بڑھاپا بہت ہی خوبصورت تھا۔ چمپئی گلابی رنگت، سفید بال جو کبھی سنہری رہے ہوں گے اور جن میں کہیں کہیں پرانا سونا چمک جاتا تھا۔ اونچی ستواں ناک،، بہت پتلے پتلے ہونٹ اور ہلکے رنگ کی آنکھیں جو کبھی بادامی رنگ کی رہی ہوں گی۔ قامت بھی خاصی تھی۔ دوسروں کے ساتھ کھڑی ہوتیں تو ہمیشہ سربلند نظر آتیں۔ مجھے ان کا شجرہ کہیں سے بھی نہ مل سکا ورنہ ان کی خوبصورتی کا راز ضرور معلوم ہو جاتا۔ بس اتنا سنا ہے کہ ایک سیدزادے تھے جو کسی دور دیس سے آئے تھے اور انھوں نے پرنانی سے، جو ہندوستانی تھیں، شادی کر لی تھی۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ نانی کی چار اولادوں یعنی تین بیٹیوں اور ایک بیٹے میں سے کسی ایک میں بھی نانی کا رنگ روپ نہیں آیا۔

میں اماں کو اکثر چھیڑنے کے لیے پوچھتا تھا:

''اماں سچ بتاؤ، نانی تو اتنی گوری ہیں تم سانولی کیوں ہو؟''

اور اماں کچھ جھینپ کر کہا کرتی تھیں:

''میں اپنے باپ پر گئی ہوں......!''

مجھے اپنے نانا کی ایک دھندلی سی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ وہ نہایت مختصر سے دبلے پتلے آدمی تھے۔ رنگ گہرا سانولا تھا اور چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی آنکھوں کے نیچے ایک بہت ہی

اونچی خم دار ناک تھی جسے دیکھ کے لگتا تھا کہ وہ چہرے کا حصہ نہیں ہے بلکہ چہرہ اس کا حصہ ہے۔

میں اپنی نانی کو بی حضور کہا کرتا تھا کیوں کہ ان کے باقی نواسے نواسیاں اور پوتا پوتی جن کی تعداد ماشاء اللہ ۲۹ ہوتی تھی، یہی کہا کرتے تھے۔ ان کی اولادیں امی کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ مگر وہ دور دور تک کھڑاؤں والی سیدانی، کھڑاؤں والی سیدانی کے نام سے مشہور تھیں۔ کیوں کہ انھوں نے کبھی کوئی جوتا چپل نہیں پہنا۔ سنا ہے شادی کے وقت بھی سہاگ کے جوڑے کے ساتھ کھڑاؤں پہن کر سسرال آئی تھیں اور کھڑاؤں بھی ویسی ہی جیسی شری رام پہنتے تھے اور جو بعد میں بھرت جی نے لے جا کر ایودھیا کے سنگھاسن پر رکھ دی تھیں۔

کھڑاؤں لکڑی کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے جس میں پاؤں تلے دبائے رکھنے کے لیے ایک لٹو جیسا لگا ہوتا ہے، جس کو انگوٹھے اور انگلی کی چمٹی میں دبا کے رکھنا پڑتا ہے۔ پتہ نہیں پرانے سادھو سنت اور ہماری نانی کس طرح اس بے لگام کھڑاؤں کو قبضے میں رکھتے تھے کہ مجال ہے جو اِدھر سے اُدھر ہو جائے، میں نے تو جب بھی کوشش کی ہمیشہ منہ کی کھائی۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میں نے ان سے کبھی پوچھا ہی نہیں کہ وہ کپڑے تو اچھے بھلے پہنتی ہیں، یعنی غرارہ، کرتا اور دوپٹا پھر کھڑاؤں کیوں کھٹکھٹاتی پھرتی ہیں؟...... اگر پوچھتا تو ضرور کوئی کہانی یا دلچسپ وجہ معلوم ہو جاتی مگر بچپن تھا اور بچپن کام کے سوالات ذرا کم ہی کرتا ہے۔

نانی، کھڑاؤں والی سیدانی کے علاوہ بھی کئی ناموں سے مشہور تھیں مثلاً اللہ والی سیدانی اور بیری والی سیدانی۔ بیری والی اس لیے کہ ان کے لمبے چوڑے آنگن میں بیری کے آٹھ پیڑ اس طرح سر جوڑے کھڑے رہتے تھے کہ سورج ڈھلنے سے پہلے ہی اندھیرا ہو جاتا تھا اور اللہ والی اس لیے کہ وہ سچ مچ اللہ والی تھیں...... چوبیس گھنٹے نمازیں پڑھتی رہتی تھیں۔ پانچ فرض نمازوں کے علاوہ تہجد، اشراق، چاشت، اوابین، قضائے عمری اور نہ جانے کیا کیا اور نفلوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ جب موقع ملا، جہاں ملا سر سجدے میں...... اور وظیفے تو سونے پر سہاگا......!

ان کے کمرے میں چوکیوں کا فرش تھا۔ جس پر ایک میلی سی چاندنی بچھی رہتی تھی اور دو تین

گاؤ تکیے رکھے رہتے تھے، ایک کونے میں ہرن کی کھال بچھی رہتی تھی جو گھستے گھستے چکنی اور سپاٹ ہو چکی تھی اور اس کے بال جگہ جگہ سے غائب ہو چکے تھے۔ یہ بی حضور کی جائے نماز تھی۔ کھال پر ایک ہزار دانہ تسبیح رکھی رہتی تھی اور ایک پرانا پھٹا ہوا پنج سورہ۔ بی حضور تہجد کی نماز پڑھ کے حلقہ کیا کرتی تھیں، وہ جائے نماز پر دوزانو بیٹھ جاتیں اور آنکھیں بند کر کے زور زور سے "اللہ ہو اللہ ہو" کی گردان کرتیں اور ان کا جسم اس طرح ہلتا ہوتا تھا جیسے اس میں چابی بھر دی گئی ہو۔ پڑھنا، پھونکنا، اتارا کرنا، دم کیا ہوا پانی اور تعویذ دینا روز مرہ کا مشغلہ تھا۔ کسی کو دعا درکار ہوتی کسی کو تعویذ کسی کو گنڈا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ آتے تھے اور بی حضور کسی کو مایوس نہیں کرتی تھیں، مگر کبھی کسی سے پیسے نہیں لیتی تھیں۔ کوئی بہت اصرار کرتا تو کہتیں:

"اچھا ٹھیک ہے جائے نماز کے نیچے رکھ دو......!"

(اللہ معاف کرے، میں نے ان کی جائے نماز کے نیچے سے کئی بار پیسے چرائے ہیں)

بی حضور اس طرح جمع ہونے والی رقم کو اپنے اوپر کبھی خرچ نہیں کرتی تھیں۔ یہ پیسے ہر سال اجمیر والے خواجہ کے عرس میں جانے کے لیے جمع کیے جاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا:

"میں نے ۴۲ برس تک بلا ناغہ خواجہ کے دربار میں حاضری دی ہے، بس ایک دفعہ نہیں جا سکی تھی......!"

اور اس ایک غیر حاضری کا ذمہ دار میں تھا۔ میں ایک زمانے تک انھیں ڈھونگی سمجھتا رہا۔ ان کی کھڑاویں، ان کی اللہ ہو، ان کی جھاڑ پھونک سب ڈراما معلوم ہوتی تھی اور وہ ایک ایسی ایکٹریس نظر آتی تھیں جو اپنے کیریکٹر کے اندر جا کر باہر آنا بھول گئی ہوں۔ حالاں کہ ان کے کرشموں اور کرامات کی درجنوں کہانیاں مشہور تھیں بلکہ اب تک ہیں۔ ان کے تعویذوں سے سوکھے پیڑوں میں پھل آجاتے، وظیفوں سے بانجھ عورتوں کے پاؤں بھاری ہو جاتے، بچھو کا زہر تو لعاب لگاتے ہی غائب ہو جاتا وغیرہ وغیرہ۔

میری ایک خالہ زاد بہن جو تقریباً ۸۰ برس کی ہیں، قسم کھا کر بیان کرتی ہیں کہ نانی کے قبضے میں جنات تھے اور اکثر ملاقات کے لیے آجاتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے اپنی

آنکھوں سے بی حضور کو جنوں سے باتیں کرتے اور ان کا حال چال پوچھتے دیکھا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جن صرف بی حضور کو دکھائی دے رہے تھے انھیں نہیں۔

میرا سگا بھائی جمشید، جو نانی کے گھر میں برسوں تک رہا ہے، اس بات کا راوی ہے کہ بی حضور اس سے ہر روز سویرے پیٹن چورا چائے کا ایک آنے والا پیکٹ اور ایک آنے کا دودھ منگایا کرتی تھیں اور اپنی چھوٹی سی پتیلی میں جس میں مشکل سے چار کپ پانی آتا تھا، چائے بنایا کرتی تھیں اور پھر سب کو بانٹا کرتی تھیں پھر بھی ایک پیالہ چائے بنانے والے کے لیے بچ جایا کرتی تھی۔ دل کو بہلانے کی حد تک تو یہ قصے اچھے ہیں مگر اس کے آگے نہیں۔ یہ کرامات، صاحبِ کرامات کی نہیں بلکہ اس عقیدے کا کھیل ہیں جو پہلے سے دل میں چھپا ہوتا ہے۔ ایک ایسی چنگاری جسے ایک پھونک کی ضرورت ہوتی ہے اور بس......!

میں کبھی کبھی نانی کے گھر جایا کرتا تھا۔ جب کہ اماں، میرے تین بھائی اور بہن مستقل وہیں رہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے دادی نے پالا تھا اور میں بڑی حویلی میں ان کے ساتھ رہا کرتا تھا مگر اماں یا دوسرے بہن بھائیوں کو وہاں آنے کی اجازت نہیں تھی کیوں کہ ساس کو بہو کی صورت سے نفرت تھی اور ابو الگ ایک گھر لینے اور چلانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ میں جب بھی جاتا نانی ذرا چوکنی ہو جاتیں کیوں کہ میں انھیں چھیڑنے، پریشان کرنے یا مذاق اڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا، اور کچھ نہ ملتا تو ایسے ایسے بے تکے سوال کرتا کہ وہ تنگ آ کر نماز کی نیت باندھ لیتیں یا بڑبڑاتی ہوئی کمرہ بند کر لیتیں۔ مجھے ان کا غصے میں تمتماتا ہوا چہرہ اور چڑھی ناک کی جھریاں دیکھنے میں بہت مزہ آیا کرتا تھا۔ ان کی دکھتی رگیں بہت سی تھیں اور کسی پر انگلی لگ جائے تو وہ تڑپ اٹھتی تھیں۔ ایک دن میں نے کہا:

''بی حضور، تمھاری بخشش تو ہو ہی نہیں سکتی۔ ہر روز تو سوال کرتی ہو اللہ کون اللہ کون ......''

بی حضور کا منہ اور آنکھیں ایسے کھلے کہ بند ہونا بھول گئے۔ جب کانوں پر یقین آگیا تو گرج کر بولیں:

"کیا بک رہا ہے بدنصیب؟ میں اللہ والی ہوں۔ یہ کفر کا کلمہ کیسے بول سکتی ہوں؟" میں نے کہا:

"تم روزانہ اللہ ہو اللہ ہو کرتی ہو یا نہیں؟"

"ہاں کرتی ہوں۔ روز کروں گی۔ مرتے دم تک کروں گی۔ اللہ ہو......!"

"تمھیں اللہ ہو کا مطلب معلوم ہے؟"

"مطلب؟" وہ ذرا چکرا گئیں "کیا مطلب ہے؟"

"انگریزی میں ہو کے معنی ہے کون۔ تو اللہ ہو کے کیا معنی ہوئے؟۔۔۔ اللہ کون۔۔۔ توبہ توبہ تم اللہ کی ذات پر سوال اٹھاتی ہو۔۔۔۔۔!"

بی حضور غصے میں تمتما اٹھیں، چہرہ ایسا لال ہوا کہ باریک باریک نیلی رگیں دکھائی دینے لگیں۔ دانت پیس کر بولیں:

"مت ستا۔ ارے کم بخت مت ستا۔ دیکھ پھر کہتی ہوں۔ جلالی وظیفے پڑھتی ہوں۔ منہ سے بددعا نکل گئی تو دین دنیا دونوں برباد ہو جائیں گے......!"

میں کہاں دبنے والا تھا ان بھبکیوں سے، سینہ تان کر بولا:

"یقین نہیں آتا تو جاؤ پوچھ لو پیش کار صاحب سے، ہو کا مطلب کون اور اللہ ہو کا مطلب اللہ کون ہوتا ہے......!"

اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر کھڑاؤں پھینک کر مارتیں، میں بھاگ کھڑا ہوا۔

یہ سلسلہ کہ ایک زمانے تک میں انھیں ڈھونگی اور ڈرامے باز کہتا رہا اور وہ مجھے ایک بدتمیز، بدنصیب لامذہب سمجھتی رہیں، اس سال ختم ہوا جس سال انھیں غریب نواز نے اپنے دربار میں طلب نہیں کیا۔ اس کہانی سے پہلے ایک چھوٹی سی کہانی اور سننی پڑے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے فلموں میں فلیش بیک آجاتا ہے کیوں کہ اس کے بغیر بی حضور کی پہلی اور آخری غیر حاضری کا پس منظر سمجھ میں نہیں آئے گا۔

میری عمر پندرہ برس کی تھی۔ پوری مونچھیں نہیں نکلی تھیں مگر ذہن بالغ ہو چکا تھا۔ غریب

بچے یوں بھی ذرا جلدی جوان ہو جاتے ہیں کیوں کہ بچپن جس معصومیت اور بے فکری کا نام ہے وہ پھٹے حالوں کے گھروں میں نہیں آیا کرتی......!

ابو کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ وہ زیادہ وقت بھوکن سرن حلوائی کی دوکان پر بیٹھ کر گزارتے تھے۔ بھوکن چاچا ان کے بچپن کے دوست تھے اور ان کی دوکان چھوٹی موٹی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھی جس میں ابو پیش پیش رہا کرتے تھے مگر مصیبت یہ تھی کہ ایماندار سیاست نام اور شہرت تو دے دیتی ہے کھانے کو پیسے نہیں دیتی۔ اس لیے باہر تو ابو کا بڑا نام تھا مگر گھر کے اندر اللہ کے نام کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں خالی بیٹھے بیٹھے سوچتا رہتا تھا کہ لوگوں کے پاس خرچ کرنے کے لیے اتنے بہت سے پیسے کہاں سے آتے ہیں۔ کسی کھاتے پیتے گھر میں جاتا تو اندازہ لگانے کی کوشش کرتا کہ اس کی خوش حالی کا راز کیا ہے۔ دھیرے دھیرے پتہ چلا کہ پیسہ تین سمتوں سے آتا ہے۔ باپ دادا کے ذریعے، نوکری کرنے سے یا بزنس کے رستے۔ باپ دادا کا قصہ تو میں بتا ہی چکا ہوں، نوکری کم عمری اور کم علمی کی وجہ سے ممکن نہیں تھی اس لیے مجھے بزنس والا آئیڈیا پسند آیا۔ مگر بزنس ایسی ہونی چاہیے جس میں پیسہ نہ لگانا پڑے۔ سوچتے سوچتے دماغ ہڑتال پہ چلا گیا مگر ایسا کوئی کاروبار سمجھ میں نہ آیا جو بغیر مال لگائے شروع ہو سکے۔ اور تب یوں ہوا کہ

"مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"

میرے دوست شکیل نے کہا:

"چلو نمائش دیکھنے چلتے ہیں......!"

یہ نمائش ایک میلہ ہوا کرتا تھا جو ہر سال شہر کے باہر لگتا تھا اور پندرہ بیس دن خوب چہل پہل رہتی تھی۔ رنگین روشنیاں، جگمگاتی دوکانیں، فلمی گانوں کا شور، حلوہ پراٹھا بناتے ہوئے ہوٹل والے۔ طرح طرح کے برقعے اور بچے۔ ہم دیر تک اس رنگا رنگ تماشے کو دیکھتے ہوئے گھومتے رہے۔ واپس جا رہے تھے تو ایک اندھیرے کونے میں سے ہنسی کی آواز سنائی دی۔ بہت سے بچے اور بڑے زور زور سے ہنس رہے تھے۔ غور سے دیکھا تو ایک Tent جیسا نظر آیا

جس میں اندھیرا تھا اور آوازیں اس کے اندر سے آرہی تھیں۔ شکیل نے کان لگا کر سنا اور بولا:

"یہ کیا چکر ہے؟"

جھانک کر دیکھا تو پتہ چلا کہ ایک چھوٹے سے اسکرین پر ٹام اینڈ جیری کی کارٹون فلم دکھائی جارہی ہے۔ دیکھنے والے چٹائیوں پر بیٹھے ہیں اور ایک لڑکا ایک پرانے سائیلنٹ پروجیکٹر کا ہینڈل گھمارہا ہے۔ میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میں نے دیکھا وہ میری ہی عمر کا ایک میلا کچیلا سا لڑکا تھا:

"آٹھ آنے نکالو......!" اس نے کہا

"کاہے کے آٹھ آنے؟" میں نے پوچھا

"سینما دیکھنا ہے نا؟۔ بڑوں کے چار آنے۔ بچوں کے دو آنے......!"

"نہیں دیکھنا ہے۔ یہ کوئی سینما ہے......!"

شکیل نے ڈانٹ کر کہا اور ہم دونوں وہاں سے چل دیے، مگر نہ جانے کیوں وہ پروجیکٹر رات بھر میرے دماغ میں چلتا رہا۔ میں نے خواب دیکھا کہ میں پروجیکٹر چلا رہا ہوں۔ پردے پہ فلم چل رہی ہے اور گھٹتی بڑھتی روشنی میں سیکڑوں لوگ تالیاں بجارہے ہیں۔ سویرے اٹھا تو ایسا لگا جیسے وہ خواب نہیں خوش خبری تھی۔ کوئی دھیرے دھیرے میرے کان میں کہہ رہا تھا اس سے زیادہ سستا اور اچھا بزنس تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے یاد آیا کہ بازار نصر اللہ خاں میں احمد بھائی ٹوپی والے کے برابر ایک چھوٹی سی دوکان پر میں نے ایسا ہی پروجیکٹر رکھا دیکھا تھا۔ دوکان پر گیا تو حیران ہو گیا۔ اوپر سے نیچے تک ایسی چیزوں سے بھری ہوئی تھی جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ اس میں دھوپ کے چشمے، مذہبی کتابیں، المونیم کے برتن اور بجلی کے پرانے پنکھے اس طرح گھل مل کر بیٹھے تھے جیسے رنگ، نسل، ذات، قبیلے کا کوئی فرق ہی نہ رہ گیا ہو اور سوشلزم آچکا ہو۔ اسی انبوہ میں دو پروجیکٹر بھی دکھائی دیے جن میں سے ایک کی شیشے کی آنکھ چمک رہی تھی دوسرے کی تھی ہی نہیں!...... یعنی اس کا لینز غائب تھا۔ ان کے پاس ہی بلیک اینڈ وائٹ فلموں کے ٹین کے زنگ لگے گول ڈبے بھی نظر آرہے تھے۔ میں دوکان کے

تختے پر بچھی ہوئی میلی دھبے دار دری پر بیٹھ گیا۔

"وہ پروجیکٹر......" میں نے کہا۔

اس آدمی نے جو ایک پرانی دیوار گھڑی کو کھولے بیٹھا تھا، بڑی دلچسپی سے مجھے دیکھا اور پھر آنکھ والا پروجیکٹر اٹھا کر سامنے رکھ دیا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس پروجیکٹر پر بہت پیار آیا۔ بالکل ایسا لگا جیسے میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ پتہ نہیں اس نے کیا کیا دیکھا ہوگا اور کیا کیا تماشے دنیا کو دکھائے ہوں گے......!

مجھے وہ بڑا اداس سا لگ رہا تھا۔ رنگ جگہ جگہ سے اتر گیا تھا۔ لیمپ باکس کا دروازہ کچھ ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ اسٹینڈ کے چار ربر میں سے ایک غائب تھا اور رلنے سے بچانے کے لیے ایک اسکرو لگا دیا گیا تھا۔ لینز پر دھول بھی جمی ہوئی تھی جو میں نے اپنی انگلی سے صاف کر دی۔

"یہ چلتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

دوکان والے نے پروجیکٹر اپنی طرف گھسیٹا۔ دو انگلیوں سے ایک چھوٹا سا ہینڈل گھمایا۔ گرگر کی ہلکی سی آواز ہوئی اور ایسا لگا جیسے بے جان مشین میں جان آگئی ہو......!

"فلم چلا کے دیکھنا ہو تو شام کو آنا۔ دن کے اجالے میں کچھ نہیں دکھائی دے گا......!" اس نے کہا۔

"شام کو؟"

میں نے کہا۔ پتہ نہیں کیوں اس پروجیکٹر کو چھوڑ کر جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ وہ آدمی بڑی دلچسپی سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کے منہ میں شاید سپاری کا ٹکڑا تھا جسے وہ دھیرے دھیرے چبا رہا تھا اور منہ سے کٹ کٹ کی آوازیں نکال رہا تھا۔ وہ پھر ایک دم سے کھڑا ہوا، ایک ڈبے میں سے ایک 35MM فلم کا ریل نکالا اور کھلی ہوئی دیوار گھڑی کو ایک طرف ہٹا کے ریل کو پروجیکٹر پر چڑھا دیا۔ اور بولا:

"ادھر آنکھ لگا کے دیکھو......!"

میں نے ایک آنکھ بند کی اور دوسری لینز میں لگا دی۔ آدمی نے ہینڈل گھمانا شروع

کردیااور میرے سامنے ایک انچ بائی سوا انچ کا فریم زندہ ہوگیااور میں جیسے کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا۔ دلیپ کمار پیانو بجارہا تھا۔ نرگس پیانو پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کی سوئی سوئی آنکھیں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں اور پیچھے کو بل کھا رہی تھی۔ میں اس جھروکے سے گزر کر پارٹی میں پہنچ گیا۔ مجھے آواز بھی سنائی دینے لگی:

''تو کہے اگر، تو کہے اگر، جیون بھر میں گیت سناتا جاؤں......تو کہے اگر......''

پروجیکٹر رک گیا، تصویر تھوڑی دیر تک لگی رہی پھر وہ بھی ہٹ گئی مگر میں اس جادو سے باہر نہیں آسکا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ چلتی پھرتی تصویریں میری رگوں میں چل رہی ہوں۔ اس آدمی نے جس کا نام رفیق بھائی تھا، ریل نکال کر رکھتے ہوئے کہا:

''ایک دم فرسٹ کلاس کنڈیشن میں ہے......!''

میں نے بڑے ادب سے پروجیکٹر کو دیکھا۔ کیا چیز ہے یہ، ایک ہی پل میں کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ اور دھیرے سے پوچھا:

''اس کی قیمت کیا ہے؟''

''ہزار روپے!''

اس نے ذرا زور سے کہا اور پروجیکٹر اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا۔

اتنا اندازہ تو تھا کہ وہ کوئی بڑی سی رقم بولے گا مگر ہزار روپے بول دے گا یہ تو میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ تب تک میں نے ہزار روپے بس ایک بار دیکھے تھے۔ رشتے کی ایک پھوپھی پاکستان سے آئی تھیں اور پاکستانی روپے دے کر ہندوستانی روپے لے رہی تھیں تو ہزار کا ایک نوٹ گر گیا تھا۔ گہرے نیلے رنگ کا بڑا سا نوٹ جس پر سفید حروف میں موٹا موٹا لکھا تھا: 'ایک ہزار' میں نے اٹھا کر انھیں دے دیا تھا۔ کاش وہ نوٹ اس وقت میرے پاس ہوتا۔

''کیا بات کرتے ہو۔ اس ٹوٹے پھوٹے پروجیکٹر کے ایک ہزار روپے کون دے گا؟''

''نیا دس ہزار کا ملتا ہے۔ جرمن ہے جرمن۔ یہ چیزیں اب ملتی کہاں ہیں؟''

اس نے دیوار گھڑی اپنی طرف گھسیٹی اور اس پر جھک گیا۔

"ٹھیک ٹھیک بتاؤ کیا لو گے؟"

"چلو۔ ۹ سو دینا۔ بس؟"

"آخری بات بولو......" میں نے کہا۔

"یہ آخری بات ہے!"

اس نے جواب دیا۔ میں بہت دیر بیٹھا رہا مگر اس نے سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ میں نے ایک آخری نظر پروجیکٹر پر ڈالی اور چل دیا۔

"۹ سو روپے"

میں اپنے دل میں ہنسا۔ چلو ہٹاؤ، کچھ اور سوچیں گے۔ مگر سوچ تو جیسے پروجیکٹر کا ریل بن گئی تھی، اتر ہی نہیں رہی تھی۔ شکیل نے میری اسکیم سنی تو اچھل پڑا:

"یہ تو کمال کا آئیڈیا ہے یار...... مگر فلم دکھائیں گے کہاں؟...... اس کے لیے تو کوئی کمرہ یا دوکان لینی پڑے گی!"

"نانی کے گھر کا پچھلا دروازہ جو گلی میں کھلتا ہے دوہرا ہے۔ یوں سمجھو ایک لمبی سی کوٹھری ہے، اس میں ایک تخت اور ایک پرانی الماری پڑی ہوئی ہے۔ اس کباڑ کو نکال دیا جائے تو پندرہ بیس آدمی آرام سے بیٹھ سکتے ہیں......!"

"پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے!"

شکیل جوش میں کھڑا ہو گیا مگر جب اس نے پروجیکٹر کی قیمت سنی تو سارا جوش ختم ہو گیا۔ بہت دیر تک مجھے گھورتا رہا پھر دھیرے سے بولا:

"۹ سو روپے...... ارے باپ رے!"

ایسا نہیں ہے کہ اس کے لیے ۹ سو یا ہزار روپے کوئی بڑی رقم تھی۔ اچھے گھر کا بیٹا تھا، باپ کا کاروبار بھی اچھا چلتا تھا مگر اس گھر میں شکیل کے علاوہ کسی نے فلم نہیں دیکھی تھی۔ ایسی جگہ سے

سینما چلانے کے لیے پیسے مانگنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔شکیل کے اپنے پاس تین سو روپے جمع تھے۔جو وہ کسی وقت بھی دینے کو تیار تھا مگر تین سو سے کیا ہوتا تھا۔ بظاہر تو اس کہانی کو وہیں دم توڑ دینا تھا مگر ایسا ہوا نہیں۔وہ پروجیکٹر میرے حواس پر اس طرح چھا گیا تھا کہ ہر وقت ہر طرف دکھائی دیتا تھا۔جب بھی وقت ملتا میں رفیق کی دوکان پر جا بیٹھتا۔اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا اور حسرت سے پروجیکٹر کو دیکھتا رہتا۔رفیق تیز آدمی تھا، دو چار دن ہی میں سمجھ گیا کہ چکر کیا ہے۔ہنس کے کہنے لگا:

''اتی محبت تو کوئی کسی لونڈیا سے بھی نہیں کرتا جتی تمھیں اس مشین سے ہوگئی ہے!''

میں بھی ہنس دیا:

''ہاں ہو تو گئی ہے رفیق بھائی مگر تم اپنی لونڈیا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینے کے لیے تیار ہی نہیں ہو!''

وہ بہت زور سے ہنسا۔اسے میرا جواب پسند آیا تھا۔وہ میری طرف جھکا اور آواز دبا کر بولا:

''اچھا تم بتاؤ، تمھارے پاس کتنے پیسے ہیں؟''

''میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔دوست کے پاس تین سو ہیں۔ بس!''

''بس؟......ارے پانچ کی تو میری خریدی ہے، تین سو میں کیسے دے دوں گا؟''

''اچھا تو پانچ سو لے لو۔سمجھو کوئی نفع نہیں کمایا......!''

مختصر یہ کہ بہت منانے، پرچانے اور خوشامد کرنے پر وہ ظالم چھ سو روپے میں پروجیکٹر اور مکی ماؤس کا ایک ریل دینے پر راضی ہوگیا۔شکیل نے اسی شام تین سو روپے لا کر دے دیے مگر شرط یہ رکھی کہ اگر کبھی اس رقم کو لوٹانے کی بات کی تو دوستی ختم ہو جائے گی۔

اب سوال یہ تھا کہ باقی کے تین سو کہاں سے لائے جائیں۔دماغ پر بہت زور ڈالا مگر

ایسی کوئی صورت نظر نہیں آئی جو ایک بچے کے جوان ارادوں کی ہمت بڑھا سکے۔ میں نے رفیق سے پندرہ دن کا وقت لیا تھا اور وہ دن منٹوں کے حساب سے بکھرتے جارہے تھے۔ میرے سارے ارادے سارے خواب صرف تین سو روپے دور تھے مگر یہ تین سو روپے کتنی دور تھے انھیں وہ پیاسا ہی جان سکتا ہے، جو صحرا میں پھنس گیا ہو۔ میری بے چینی اور بے تابی کا یہ عالم تھا کہ راتوں کو اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا اور چاروں طرف دیکھتا تھا کہ گھر میں شاید کوئی چیز نظر آجائے جسے بیچ کر پیسے حاصل کیے جاسکیں مگر وہاں اندھیرے اور ننگی دیواروں کے سوا تھا کیا۔ اماں کو ساری کہانی معلوم تھی اور انھیں مجھ سے ہمدردی بھی تھی۔ ایک دن مجھے بہت اداس دیکھ کر کہنے لگیں:

''تو بی حضور سے کیوں نہیں مانگ لیتا؟''

''بی حضور؟''

میں حیران ہوگیا۔

''ہاں ہاں۔ اتنے تو نکل ہی آئیں گے ان کے پاس؟''

''اول تو ان کے پاس ہوں گے نہیں اور ہوئے بھی تو مجھے کبھی نہیں دیں گی!''

''کیوں نہیں دیں گی؟...... دنیا بھر کا خیال کرتی ہیں، سگے نواسے کی مدد نہیں کریں گی کیا؟''

''نہیں کریں گی اماں، نہیں کریں گی۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ان کے نزدیک سینما دیکھنا گناہ عظیم ہے۔ وہ اس گناہ میں کبھی شریک نہیں ہوں گی۔ سنتے ہی کوسنے اور بددعائیں دیں گی اور کفر کا فتویٰ جاری کردیں گی......!''

مگر اماں تو اماں تھیں۔ اڑ گئیں:

''چل ہٹ۔ میں بات کروں گی!''

اماں نے بی حضور کو میری ضرورت اور ضرورت کی وجہ بتائی تو وہی ہوا جو ہونا چاہیے

تھا۔ وہ تو آپے سے باہر ہوگئیں۔ ایسی ایسی باتیں سنائیں کہ اماں کو رونا آگیا اور میں گھر سے باہر بھاگ گیا۔ رفیق کو جب پتہ چلا کہ پیسوں کا بندوبست نہیں ہوسکا ہے تو بہت زور سے ہنسا۔ بالکل ایسا لگا جیسے اس نے کوئی بہت ہی گندی سی گالی دی ہو:

"مجھے معلوم تھا، یہ کھیل تمہارے بس کا نہیں ہے......!"

میں دیر تک حسرت سے پروجیکٹر کو دیکھتا رہا۔ پھر چلا آیا۔ یہ کہانی تو یہاں بھی ختم ہوسکتی تھی مگر ہوئی نہیں۔ ایک تو یہ ہوا کہ بی حضور کے لیے میری نفرت کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ چاہتیں تو کسی سے مانگ کر بھی دے سکتی تھیں مگر انھیں تو اپنا مذہبی ڈھونگ دکھانا تھا اس لیے جان بوجھ کر میری مدد نہیں کی تھی۔ چوں کہ اماں وہاں رہتی تھیں اس لیے ان کے گھر جانا ہی پڑتا تھا۔ میں جتنی دیر وہاں ٹھہرتا انھیں گھورتا رہتا یا طعنے مارتا رہتا۔ ایک دن وہ کسی عورت کو محنت کے فائدے سمجھا رہی تھیں:

"کلام پاک میں لکھا ہے کہ جو لوگ اپنی مدد آپ کرتے ہیں ان کی مدد اللہ بھی کرتا ہے......!"

مجھ سے رہا نہ گیا، میں نے کہا:

"اللہ تو مدد کرتا ہے۔ بندے کسی کی مدد نہیں کرتے۔ خالی نصیحتیں کرتے ہیں"

بی حضور نے سر گھما کے مجھے دیکھا اور دیر تک گھورتی رہیں پھر واپس اپنی باتوں میں لگ گئیں۔

وہ فروری کا مہینہ تھا مگر شام کو بے موسم برسات ہوگئی تو سردی اور بھی بڑھ گئی۔ میں نانی کے گھر پر ہی رک گیا۔ بیری کے پیڑ کے نیچے لکڑی کی ایک پرانی کرسی پر بیٹھ کر اوپر دیکھا تو بیری کی پتلی پتلی کانٹے دار ٹہنیوں کے جال میں چاند پھنسا ہوا دکھائی دیا۔ شاید چودھویں رات تھی، نیلگوں دودھیا روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور میرے چاروں طرف زمین پر چاندنی کے چھوٹے چھوٹے قتلے اس طرح پڑے تھے جیسے چاندی کے گول گول چمکتے ہوئے روپے

بکھر گئے ہوں۔ میں دیر تک ان روپوں کو گنتا رہا مگر وہ ہزاروں تھے، میں گنتے گنتے تھک گیا:

''اگر اتنے روپے مل جائیں تو؟''

میں نے آنکھیں بند کر کے سوچا۔ پیروں کی آہٹ سنائی دی تو آنکھ کھول کر دیکھا۔ بی حضور آرہی تھیں۔ ان کی سوتی کالی شال پر چاندنی کے روپے اس طرح گر رہے تھے جیسے کوئی نچھاور کر رہا ہو۔ وہ میرے پاس آکر رک گئیں۔ شال میں سے میلے رومال میں بندھی ایک پوٹلی نکالی اور میری طرف بڑھا دی۔

''تجھے تین سو روپے چاہیے تھے۔ یہ پورے تین سو ہیں!''

میں انھیں دیکھتا رہ گیا۔ بہت کوشش کی کہ کچھ بولوں مگر آواز ہی نہیں نکلی۔ کوئی چیز گلے میں پھنس گئی تھی، پتہ نہیں وہ آواز تھی، الفاظ تھے یا شرمندگی......!

''بس اتنی مہربانی کرنا کہ میرے گھر کو سینما گھر مت بنانا......!''

انھوں نے پوٹلی میری گود میں ڈالی۔ سر پر ہلکے سے ہاتھ پھیرا اور چلی گئیں......!

یہ کہانی یہاں بھی ختم ہو سکتی ہے مگر تھوڑی سی باقی ہے۔ سچی کہانیوں کی مصیبت یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے چلتی ہیں لکھنے والے کے حکم کی پابند نہیں ہوتیں۔

دوسرے دن سویرے جب میں رفیق کی دوکان پر جا رہا تھا تو اماں نے بتایا کہ بی حضور نے اجمیر شریف جانے کے لیے جو پیسے جمع کیے تھے وہ دے دیے ہیں۔ ان کے ساتھ جانے والے جا چکے ہیں مگر وہ خواجہ کے سلام کو حاضر نہیں ہوں گی۔ اس بات کا اثر دل پر تو بہت ہوا۔ اُڑتے ہوئے پیر بھی رک گئے۔ کیوں کہ بی حضور اجمیر جانے کا کرایہ اور وہاں دس دن ٹھہرنے کا خرچا سال بھر تک جمع کرتی رہتی تھیں اور اس طرح خوش ہوتی ہوئی جاتی تھیں کہ وہ پرانی ٹھمری یاد آجاتی تھی:

''چلی گوری پی سے ملن کو چلی......''

پتہ نہیں اجمیر میں انھیں کیا مل جاتا تھا کہ واپس آکر مہینوں چہکتی رہتیں اور اگلے سال کے خواب دیکھتی رہتیں۔ میری وجہ سے ان کا برسوں پرانا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس کا افسوس تو ہوا مگر

دل کی آواز نے حوصلہ دیا:

"ارے بی حضور، پروجیکٹر آنے دیجیے۔ اگلے سال اجمیر شریف کا سارا خرچا میں اٹھاؤں گا......"

دوکان پر پہنچ کر میں نے چھ سو روپے رفیق کے سامنے رکھ دیے:

"پروجیکٹر کہاں ہے نکالو......!"

رفیق نے دو تین بار مجھے اور نوٹوں کو دیکھا پھر بولا:

"وہ تو بک گیا......!"

"بک گیا؟...... مگر تم نے تو وعدہ کیا تھا رفیق بھائی......"

"پندرہ دن کا وعدہ کیا تھا۔ مہینے سے اوپر ہو چکا ہے......!"

رفیق سچ بول رہا تھا۔ میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ ٦ سو روپے کا بوجھ اٹھائے اس خالی جگہ کو دیکھتا رہا جہاں پہلے پروجیکٹر رکھا رہتا تھا اور اب ایک بند گھڑی نظر آ رہی تھی۔ دوکان سے واپسی پر میں شکیل سے ملا اور اس کے تین سو روپے شکریے کے ساتھ واپس کر دیے۔

بی حضور چوکی پر دوزانو بیٹھی وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور سر ہل رہا تھا۔ میں نے ان کے نوٹ اسی میلے رومال میں لپیٹ کر جانماز پر رکھے اور آنسو پونچھتا ہوا باہر نکل گیا۔

آج برسوں بعد جب میں انھیں یاد کرتا ہوں تو یہی خیال آتا ہے کہ اگر حوریں بوڑھی ہو جایا کرتیں تو بالکل بی حضور جیسی نظر آتیں......!

☆☆☆

فقیر، بادشاہ

بھنڈی بازار کے فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور میں ایک پتھر پر ٹکا ہوا، میلی گندی اور پھٹی ہوئی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اس طرح کتابیں چھانٹنا اور خریدنا میرا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ خرابوں میں خزانے ملے ہیں۔ پرانی کتابوں کی خوشبو اور ان پر جمی ہوئی وقت کی دھول کا بھی اپنا ہی ایک نشہ ہوتا ہے اور اس کا مزہ وہی جانتے ہیں جنھوں نے ادب کی تلچھٹ انگلیوں سے چاٹی ہو۔ میں آس پاس کے شور اور چہل پہل سے بے پروا اپنی ریسرچ میں لگا ہوا تھا کہ نظر اچانک ایک بے حد دبلے پتلے اور بہت لمبے آدمی پر پڑی، سفید بال، سفید داڑھی، آنکھوں پر سنہری چشمہ، بے داغ سفید کپڑے اور سیاہ جیکٹ دیکھ کے لگا کہ یہ کوئی عام آدمی نہیں ہے، مگر پیر دیکھتے ہی سوچ رُک گئی۔ اس کے پیروں میں جوتے نہیں تھے۔ میں نے حیران ہو کر کئی بار سر سے پاؤں تک دیکھا اور سوچا سب کچھ تو ٹھیک ٹھاک لگ رہا ہے پھر ننگے پاؤں کیوں ہے؟ ذہن نے فوراً تاویل دی صورت سے مسلمان لگتا ہے، مسجد گیا ہوگا اور بے چارے کے جوتے چوری ہو گئے ہوں گے۔ ایسی وارداتیں تو پرانے زمانے سے ہوتی آئی ہیں۔ حالی نے کہا تھا:

"اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار"

مگر اس آدمی کی چال سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ پہلی بار جوتوں سے محروم ہوا ہے۔ وہ گندے، اونچے نیچے، پتھریلے فٹ پاتھ پر اس طرح چلا جا رہا تھا جیسے پیروں کے نیچے ریت اور

کنکر نہ ہوں ہری ملائم گھاس بچھی ہو۔اس کے ہاتھ میں کالے رنگ کا ایک دو ڈھائی فٹ کا بید جیسا تھا جسے وہ کبھی کبھی اپنی پنڈلی پر اس طرح مار رہا تھا جیسے اسے بجا کر دیکھ رہا ہو۔اس کی آنکھیں سڑک کی دوسری جانب کھڑی ہوئی عمارتوں میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔کوئی پاگل ہوگا بے چارہ، میں نے سوچا۔تھوڑی دیر میں وہ ننگے پاؤں میرے پاس سے گزرے اور پھر سیکڑوں جوتوں اور چپلوں کی بھیڑ میں گم ہو گئے اور کچھ دنوں بعد میرے ذہن سے بھی غائب ہو گئے۔ان ننگے پیروں میں ایسی کوئی بات تھی ہی نہیں کہ یاد رہ جاتی۔وہ کوئی مینا کماری کے پاؤں تو تھے نہیں جن کے بارے میں کمال امروہی نے کہا تھا:

"انھیں زمین پر نہ اتاریے گا، میلے ہو جائیں گے۔"

وہ تو بڑے بے ڈھنگے سے پاؤں تھے۔ہڈیاں ابھری ہوئی، چاروں انگلیاں پھیلی ہوئی، موٹے موٹے گول انگوٹھے اور پھٹی ہوئی ایڑیاں بالکل کسی برے حال مزدور کی طرح!

کچھ دنوں بعد ایک خبر بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ سارے اخباروں میں دکھائی دی کہ ملک کے نام ور پینٹر ایم ایف حسین کو ویلنگ ڈن کلب سے اس لیے نکال دیا گیا کہ وہ جوتے نہیں پہنے ہوئے تھے اور انگریزی تہذیب جوتوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتی ہے۔ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ حسین صاحب کبھی جوتے پہنتے ہی نہیں ہیں ہمیشہ ننگے پاؤں رہتے ہیں اور اسی حال میں ساری دنیا میں گھومتے ہیں۔طرہ یہ کہ حسین صاحب کی تصویر بھی چھپی تھی۔اچانک مجھے یاد آیا:

"ارے! انھیں کو تو میں نے بھنڈی بازار کے فٹ پاتھ پر دیکھا تھا۔او ہو، تو یہ ہیں
مشہور و معروف مقبول فدا حسین، جن کے بہت چرچے سنے ہیں ہم نے۔۔۔"

حسین صاحب اکثر نظر آجایا کرتے تھے، کبھی کسی پارٹی میں، کبھی کسی ہوٹل میں، کبھی کسی تھیٹر میں اور میں انھیں دور سے دیکھا کرتا تھا۔وہ چہرے جنھیں آپ پہچانتے ہیں اُن پر سے نظر پھسلتی نہیں ہے رُک جاتی ہے۔کئی بار آنکھیں چار بھی ہوئیں اور ان آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ نے مجھے ہمیشہ اس طرح دیکھا جیسے وہ مجھے جانتے ہوں۔حالاں کہ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے نہیں جانتے۔ایک عجیب کشش تھی ان کی شخصیت میں جو کبھی شفقت معلوم ہوتی کبھی دوستی اور

بھی احترام۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اجنبی بھی ملتا تو یہ، اَثر لے کر پلٹتا کہ وہ تو حسین کو جانتا ہی ہے، حسین بھی اُسے جانتے ہیں۔

پرتھوی تھیٹر میں 'تمھاری امرتا' کا شو ختم ہوا تو میں CURTAIN CALL کے لیے اسٹیج پر آیا۔ تالیوں کا جھک جھک کے شکریہ ادا کیا اور جب اُتر کے جانے لگا تو کسی نے ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے دیکھا وہ حسین صاحب تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے، مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ انھوں نے میرا ہاتھ زور سے دبایا اور کہا:

"بہت اچھا... بہت اچھا لکھا ہے..."

یہ ایک جملے کی ملاقات اُن بے گنتی ملاقاتوں کا عنوان تھی جو اُن کو ملک بدر کیے جانے تک ہوتی رہیں!

شروع شروع کی ملاقاتیں کیا تھیں بس آمنا سامنا تھا جس میں میری وہی حالت ہوتی تھی جو پہلی بار تاج محل دیکھنے والے کی ہوتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا دیکھے، کہاں سے دیکھے اور کیا کہے؟

حسین صاحب بڑے پیار سے ملتے، میری فلموں اور ڈراموں کا ذکر کرتے۔ پرانے لوگوں کے قصے بھی سناتے۔ لیکن مجھ پر ان کی شخصیت کا رعب ایسا چھایا رہتا کہ باوجود کوشش کہ ایک دوری بنی رہتی... یہ دوری اس دن کم ہوئی اور قربت بڑھی جس دن میرے دوست علی کا فون آیا۔

حسین صاحب ملنا چاہتے ہیں۔ طے پایا کہ ہم تاج ہوٹل کی کافی شاپ میں ملیں گے اور لنچ ساتھ میں لیں گے۔ میں پہنچا تو حسین صاحب رول کیے ہوئے پاپڑ کے ٹکڑے کر کے پلیٹ میں سجا رہے تھے اور علی ان کے سامنے بیٹھا چائے کے گھونٹ لے رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں یہاں علی کا تعارف کرانا ضروری ہو جاتا ہے... علی کا پورا نام علی پیٹر جان ہے۔ اس انوکھے نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مسلم باپ نے علی رکھا تھا۔ کرسچن ماں پیٹر کہتی تھی اور جان کو سرنیم سمجھ لیجیے۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ کسی دیسی شراب کی بھٹی پر رات گزار کے سیدھا چلا آرہا ہے، ڈھیلے ڈھالے کنجلے ہوئے کپڑے، بکھرے بال، ادھ کھلی آنکھیں اور آواز بھی شرابیوں جیسی یعنی کچھ بھرائی

ہوئی، کچھ اٹکتی ہوئی۔ مگر علی بالکل ویسا نہیں ہے جیسا نظر آتا ہے۔ وہ انگلش کا مانا ہوا صحافی ہے۔ اس کی بے حد خوبصورت اور شاعرانہ زبان پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا دماغ کسی بھی Computer سے زیادہ تیز چلتا ہے۔

علی، حسین صاحب کے بہت قریب رہا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ آخری عمر میں جو لوگ ان کے بہت ہی قریب رہے ان میں سے ایک علی بھی ہے۔ میں جیسے ہی بیٹھا انھوں نے ایک پاپڑ رول میرے ہاتھ میں دیا اور علی سے کہا:

"بتاؤ.....!"

علی نے اپنی بھرائی ہوئی آواز میں اٹک اٹک کر بتایا کہ حسین صاحب ایک تیسری فلم بنانے کے موڈ میں ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم یہ فلم لکھو۔! ہم لوگ دیر تک اسٹوری لائن پر سوچتے اور بحث کرتے رہے۔ اچانک انھوں نے کہا:

"ارے تین بج رہے ہیں۔ کیا کھانا نہیں کھانا ہے؟"

پھر مجھ سے پوچھا:

"کیا کھائیں گے؟"

"آپ جو بھی آرڈر کریں، اس میں Share کریں گے۔"

اور انھوں نے جو آرڈر دیا وہ میں تو کیا کوئی بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ انھوں نے اشارے سے کیپٹن کو پاس بلایا اور کہا:

"قیمہ پاؤ.....!"

ہر مسلم ہوٹل میں ملنے والی غریبوں کی پسندیدہ یہ معمولی Dish تاج ہوٹل میں بیٹھ کر کھانے کا کمال صرف حسین صاحب ہی دکھا سکتے تھے۔ یہی نہیں کھانے کے بعد ان کی اسپیشل چائے بھی پیش کی گئی جو صرف اور صرف انھیں کے لیے بنائی جاتی تھی۔

حسین صاحب دو فلمیں "گج گامنی" اور "میناکشی" بنا چکے تھے۔ یہ دونوں فلمیں باکس آفس پر بری طرح فلاپ ہوئی تھیں اور کروڑوں کا نقصان ہوا تھا۔ مگر حسین کو پیسے کی کیا پروا تھی۔

وہ کہا کرتے تھے۔

''میں فلم اپنے اور اپنے تین دوستوں کے لیے بناتا ہوں۔ اگر ان کو پسند آ گئی تو میری محنت وصول.... من پسند کام میں نفع نقصان نہیں دیکھا جاتا۔''

حسین صاحب کے لیے فلم کیا تھی اور وہ کیوں بناتے تھے یہ ان کا اپنا معاملہ تھا میرے لیے تو سراسر عزت افزائی تھی کہ حسین جیسا آدمی جس کے اشارے پر کوئی بھی رائٹر دوڑا چلا آئے مجھ سے اپنی فلم لکھوا رہا ہے۔ پتہ نہیں انھیں میری کون سی ادا بھا گئی تھی۔

حسین نے بتایا کہ ان کے ذہن میں کوئی کہانی نہیں ہے۔ بس ایک خیال ہے کہ اگر تین جوان خوبصورت بہنیں ہوں اور تینوں میں ایک ایک عیب ہو یعنی ایک اندھی ہو، دوسری بہری ہو اور تیسری گونگی لیکن تینوں بہنیں ایک دوسرے کی کمزوری کو اس طرح سنبھالتی ہوں کہ سچویشن کبھی خراب نہ ہو۔ میں حیران تھا کہ گونگی بہری اور اندھی لڑکیوں پر کامیڈی فلم کیسے بنے گی؟ مگر انھیں پورا پورا بھروسا تھا کہ بنے گی اور خوب بنے گی۔ کہنے لگے:

''میں جب کوئی پینٹنگ شروع کرتا ہوں تو ذہن میں ایک دھندلا سا خاکہ ہوتا ہے۔ مگر جیسے جیسے برش چلتا جاتا ہے خاکہ بھی نکھرتا جاتا ہے اور آخر میں تصویر بن جاتی ہے۔ اگر تمہیں آئیڈیا پسند ہے تو قلم اٹھاؤ، کہانی خود بخود بنتی چلی جائے گی۔!''

اس کہانی کے سلسلے میں ان سے درجنوں ملاقاتیں ہوئیں۔ کبھی مجھے کہیں بلا لیتے اور کبھی خود آ جاتے۔ وہ واقعہ بڑا دلچسپ ہے جب وہ پہلی بار میرے سیٹنگ روم میں آئے تھے۔ ایک دن گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا تو کھڑے ہوئے تھے۔ آداب سلام کے بعد پوچھا:

''میناکشی دیکھی ہے تم نے؟''

''جی نہیں!'' میں نے عرض کیا۔

''چلو دیکھتے ہیں۔ لگاؤ......!''

انھوں نے شیروانی کی جیب میں سے DVD نکال کر دی اور گاؤ تکیے سے لگ کر ٹانگیں

پھیلا دیں۔

"چائے پئیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"پی لیں گے۔"

انھوں نے سر ہلایا اور فلم میں اس طرح کھو گئے جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔

میں نے آفس بوائے کو سمجھا رکھا تھا کہ جب کوئی Important آدمی آئے تو چائے کس طرح پیش کرے وہ بڑے تمیز سے اندر آیا۔ ٹرے میں کپڑا بچھا ہوا، میرے بہترین سیٹ کی چائے دانی پر Teacozy ڈھکی ہوئی۔ شکر الگ، کھولتا ہوا دودھ الگ اور طشتریوں میں اُلٹے رکھے ہوئے کپ۔ ہر چیز پرفیکٹ تھی۔

حسین صاحب نے ٹرے کو دیکھا اور ایسا منھ بنایا جیسے چمچے کی جگہ چھپکلی نظر آ گئی ہو۔ کچھ دیر تک ٹرے کو دیکھتے رہے پھر پوچھا:

"پتی کون سی ہے؟"

"تاج محل ہے!"

میں نے بتایا۔ وہ اچانک آفس بوائے راجیش کی طرف مڑے۔

"دودھ، شکر ہے؟"

راجیش بے چارہ حیران ہو گیا۔ گھبرا کے بولا:

"جی بہت ہے۔"

حسین صاحب کھڑے ہو گئے۔

"چلو میں بتاتا ہوں چائے کیسے بناتے ہیں۔!"

"ارے ارے، یہ کیا کر رہے ہیں؟ راجیش کو سمجھا دیجیے یہ بنا کے لائے گا۔"

مگر تب تک وہ کچن میں پہنچ چکے تھے۔

"اسے بنانا ہی نہیں آتی تو کیا بنائے گا؟"

اور پھر انھوں نے چائے بنانی شروع کی۔ چائے کو اتنا اُبالا کے بے چاری پتیوں کا دم ہی نکل

گیا۔ پھر اس میں دودھ اور شکر ڈال کے اس وقت تک کھولاتے رہے جب تک وہ برتن سے باہر نہ نکلنے لگی۔ مگر حسین صاحب نے معاف نہیں کیا۔ جب چائے کا رنگ کسی ساؤتھ انڈین حسینہ کے گالوں جیسا یعنی سُرخی مائل سانولا ہوگیا تو بڑی احتیاط سے ایک گلاس میں چھانا اور فرمایا:

"اِسے کہتے ہیں چائے!"

میں اور راجیش حیرت سے انھیں دیکھ رہے تھے اور وہ گلاس اس طرح لیے کھڑے تھے جیسے وہ چائے کا گلاس نہ ہو آسکر ہو۔

حسین صاحب کی چائے کی چاہت کے درجنوں قصے مشہور ہیں جنھیں سن کر مولانا آزاد کی غبارِ خاطر والی چائے کچھ پھیکی لگنے لگتی ہے۔ ورلی کا فیئر ڈیل، بوری بندر کا نیو امپائر، کولابا کا بغدادی اور بھنڈی بازار کا کیفے نظاری کی کرسیاں اور پرانے ویٹر آج بھی گواہی دے سکتے ہیں کہ حسین نے وہاں کتنے ہزار کپ اپنی پسندیدہ چائے کے خالی کیے ہیں جسے ایرانی ہوٹلوں کی اصطلاح میں "کٹنگ چائے" کہا جاتا ہے۔ ان تمام ہوٹلوں میں ان کی ٹیبل اور کرسی مخصوص تھی بلکہ ویٹر بھی خاص ہی ہوتا تھا جو اُن کے مزاج اور پسند کو سمجھتا تھا۔ فیئر ڈیل کے حمید بھائی ان کے پسندیدہ ویٹروں میں سے ایک تھے۔ وہ جب بھی پہنچتے حمید بھائی کی باچھیں کھل جاتیں۔ وہ چائے پلاتا رہتا اور حسین صاحب اس سے دنیا بھر کی باتیں کرتے رہتے۔ چائے پیتے وقت عام طور پر ایک پاؤں کرسی کے اوپر رکھ لیا کرتے تھے اور چائے کو طشتری میں ڈال کر چسکیاں لیتے تھے۔ وہ کہتے تھے چائے پینے کا صحیح طریقہ یہی ہے۔ حمید کا کہنا ہے کہ حسین کا آنا عید کے آنے کی طرح ہوتا تھا۔ کیوں کہ جب وہ آتے تو حمید کو پانچ سو اور باقی سب کو سو سو روپے ملتے۔ ان میں ٹیبل صاف کرنے والا لڑکا بھی شامل ہوتا تھا۔ آج بھی جب حمید کے سامنے حسین صاحب کا ذکر آجاتا ہے تو اس کی آنکھیں بھیگنے لگتی ہیں اور وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بھرے گلے سے بولتا ہے۔

"وہ آدمی نہیں تھا صاحب، فرشتہ تھا، فقیر تھا، بادشاہ تھا۔ نہ جانے کیا تھا۔!"

گرانٹ روڈ کے سواتی ہوٹل اور تاردیو کے ٹھل بھیل پوری والے کے ہاں لائن لگا کر بھیل پوری، بٹاٹا پوری کھانا، سڑکوں کے کنارے بکنے والے وڑے اور بھجیا کے چٹخارے

لینا اور رستے پر چلتے چلتے بھٹے کے مزے لینا آئے دن کی بات تھی۔

یہ سب کچھ سننے اور پڑھنے میں بڑا عجیب سا لگتا ہے کہ ایک ایسا شخص جس کی ایک ایک تصویر لاکھوں روپے میں فروخت ہوتی ہو، سڑک پر کھڑے ہو کر بھٹے کھا رہا ہے یا کسی گندے سے ہوٹل میں کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر چائے پی رہا ہے۔ مگر جاننے والوں کے لیے عجیب نہیں ہیں۔ ان تمام چیزوں سے حسین کا بہت پرانا اور گہرا رشتہ تھا۔ اس زمانے کا جب ایک مفلس حسین فاکلینڈ روڈ کی ایک گندی گلی میں الفریڈ ٹاکیز کے لیے فلموں کے بینر بنایا کرتا تھا اور اسے چار آنے اسکوائر فٹ کے حساب سے مزدوری ملا کرتی تھی۔ اس وقت یہ بھٹے، یہ بھجیا اور یہ وڑے تاج کے COURSE 20 ڈنر سے بڑھ کر ہوا کرتے تھے۔ حسین صاحب نے بتایا تھا کہ وہ سترہ برس کی عمر میں بمبئی آئے تھے کیوں کہ باپ کے پاس کوئی کام نہیں تھا اور آمدنی کا کوئی سہارا بھی نہیں تھا خود حسین کو بھی کوئی کام نہیں آتا تھا سوائے پینٹنگ کرنے کے۔ ان کا ارادہ تو یہ تھا کہ اگر کوئی اور کام نہ بھی ملا تو گھروں میں رنگ و روغن کر کے پیسے کما لیں گے۔ کام کی تلاش میں گھوم رہے تھے کہ فاک لینڈ روڈ کی گلی میں ایک آدمی پر نظر پڑی جو زمین پر کپڑا بچھائے ہوئے تصویر بنانے کی کوشش کر رہا تھا یہ کسی فلم کی ہورڈنگ تھی۔ حسین بہت دیر تک دیکھتے رہے پھر آدمی کے پاس جا کے بولے مجھے بھی کوئی کام دیجیے اس آدمی نے اس دبلے پتلے لمبے لڑکے کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پوچھا:

''کیا کرنا آتا ہے۔؟''

''حسین نے کہا کچھ تصویریں بنا لیتا ہوں۔!''

اس آدمی نے برش حسین کے ہاتھ میں دیا اور کہا:

''بناؤ!''۔

حسین نے ہورڈنگز Hordings بنانی شروع کر دیں اور وہیں ڈیرا جما دیا۔ رات کو فٹ پاتھ پر سو جایا کرتے تھے اور صبح کو ناشتہ کرنے کے لیے ''حسینی کھچڑی والا'' کی دکان پر چلے جایا کرتے تھے جو پانچ پیسے میں ایک پلیٹ کھچڑی بیچتا تھا اور دال مفت مل جاتی تھی مزیدار بات

یہ کہ حسینی، حسین پر مہربان بھی بہت تھا اور مہینوں ادھار کھلاتا رہتا تھا۔

میں سوچتا ہوں تو کبھی کبھی لگتا ہے کہ حسین ایک نہیں دو تھے۔ایک وہ حسین جس کا فن وقت سے ایک قدم آگے چلتا تھا اور دوسرا وہ حسین جو الفریڈ ٹاکیز کی گلی سے کبھی باہر نہیں آیا۔ہمیشہ وہیں رہا۔اپنی فقیری میں خوش، اپنی غریبی پر نازاں۔

نہ پوچھ وسعتِ مے خانۂ جنوں غالبؔ

جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

میں بھی جذبات میں کہاں سے کہاں نکل گیا... ہاں تو بات ہو رہی تھی تین لڑکیوں والی فلم کی۔

حسین صاحب فلم کی کاسٹ کو لے کر خاصے پریشان تھے۔جب بھی آئے یہ ذکر ضرور آتا کہ ان تین کرداروں میں کس کو لیا جائے؟ چوں کہ حسین صاحب فلمیں دیکھنے کے بہت شوقین تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک شو دیکھ کر نکلے اور فوراً دوسرے شو میں بھی گھس گئے۔اس لیے تمام نئی ہیروئنوں پر جم کر تبصرے کرتے اور انھیں نمبر دیتے۔وہ اپنی فلم میں ایسی لڑکیوں کو لینا چاہتے تھے جو ہندوستانی حسن کا نمونہ ہوں۔ چہرے پر نمک ہو اور تمکنت بھی۔جسم سڈول اور بھرا ہوا ہو۔ آنکھوں میں مستی ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ ہو اور بال لمبے ہوں....شاعر اور مصور کے معیار پر پورا اترنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی اور پھر مصور بھی حسین جیسا۔!

''ایک دن کہنے لگے۔''

''پتہ نہیں اس فلم انڈسٹری کو کیا ہو گیا ہے۔نہ اچھی فلمیں بنتی ہیں نہ اچھی لڑکیاں ملتی ہیں!''

دیر تک برا بھلا کہتے رہے پھر بولے:

''ایک کام کرتے ہیں۔ایک ہی لڑکی کو تین رول دے دیتے ہیں۔ایک اندھی ایک بہری ایک گونگی اور تینوں ہم شکل....مزہ آجائے گا۔کم سے کم ایک لڑکی تو مل ہی جائے گی۔!''

میں نے عرض کیا۔

"آپ نے میناکشی میں تبو کو تین کردار دیے تھے۔ اب یہاں بھی کچھ ایسا ہی کریں گے تو....."

بات کاٹ کر بولے:

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے مگر لڑکیاں تو ملنی چاہئیں!"

ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ وہ لڑکی جسے وہ مکمل عورت کہا کرتے تھے یعنی مادھوری دکشت فلموں سے جا چکی تھی اور حسین اس کے چھوڑے ہوئے خالی کینوس پر چہرے سجا سجا کر دیکھ رہے تھے۔

خدا خدا کر کے دو لڑکیوں پر راضی ہو گئے ایک ارملا ماتونڈکر اور دوسری سونالی کلکرنی۔ تیسری کا مسئلہ پھر بھی اٹکا ہوا تھا۔ ایک دن ان کا فون آیا۔

"امرتا راؤ کیسی رہے گی؟"

"بہت اچھی رہے گی۔"

"کیا آپ ملے ہیں اس سے؟

میں نے پوچھا:

"مل رہا ہوں۔" دوسری طرف سے آواز آئی "یہیں ہے میرے پاس!"

پھر ہنسے اور بولے:

"اس کی فلم دیکھ رہا ہوں۔"

"اس کی آنکھیں بولتی ہیں۔ گونگی کے لیے بالکل فٹ ہے!"

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ چلو اچھا ہوا۔ یہ مسئلہ بھی طے ہو گیا۔ حسین صاحب دبئی چلے گئے اور کوئی مہینے بھر بعد لوٹے تو دھماکہ کر دیا۔

ہم لوگ سانتا کروز کے سینٹار ہوٹل کے کافی شاپ میں بیٹھے تھے۔ حسین صاحب بہت تھکے تھکے سے لگ رہے تھے کچھ بے چین بھی تھے۔ بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ اچانک بولے۔

"آپ کے پاس ایسا کوئی سبجکٹ ہے جو مادھوری کو لے کر بنایا جا سکے؟"

"مادھوری؟"

میں نے اور علی نے ایک ساتھ پوچھا۔حسین صاحب نے سر ہلایا۔

"مادھوری!"

"مگر وہ تو فلم لائن چھوڑ کر امریکہ جا چکی ہے!"

علی نے کہا۔

وہ بہت دیر تک اپنے لمبے سے برش کے ساتھ کھیلتے رہے پھر بولے۔

"لانے کی کوشش تو کی جا سکتی ہے!"

"اور تین بہنوں کا کیا ہوگا۔؟میں نے پوچھا۔

"بعد میں بنائیں گے۔ابھی تو بہت سی فلمیں بنانی ہیں!"

انھوں نے جیب سے کسی ایئر لائن کا ٹکٹ نکال کر دیکھا اور کہا:

"میں احمد آباد جا رہا ہوں"

"گاڑی باہر کھڑی ہے آپ لوگ لے جانا!"

اور خود پیدل ایئر پورٹ کی طرف چل دیئے۔گھر آ کر میں نے "تین بہنیں" کا فائل بند کر دیا۔مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اب یہ فلم کبھی نہیں بن سکے گی کیوں کہ اُرملا، امرتا یا سونالی اس جگہ کو نہیں بھر سکتی تھیں جو مادھوری نے خالی کی تھی۔

فیض نے پوچھا تھا۔

"کوئے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ مے خانہ ہے
آج کل صورت بربادی یاراں کیا ہے"

انھیں کیا معلوم تھا کہ یاروں کی بربادی کے لیے ایک جگہ سینما ہال بھی ہوتی ہے۔جس کے اندھیرے میں دل و جان لٹ جاتے ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی۔حسین صاحب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

لبرٹی سینما میں فلم "ہم آپ کے ہیں کون؟" دیکھنے کے لیے گئے تھے۔ باہر نکلے تو

مادھوری دکشت کی محبت میں دونوں جہان ہار چکے تھے۔

یہ فلم چار پانچ سال تک لگاتار چلتی رہی اور حسین صاحب لگاتار دیکھتے رہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں ساٹھ بار دیکھی۔ کچھ کا اندازہ ہے سو دفعہ دیکھی ہوگی۔ خود حسین کو بھی یاد نہیں کہ انھوں نے کتنے شوز دیکھے۔ وہ بتاتے تھے کہ جب تک فلم چلی لبرٹی کے ہر شو میں ایک سیٹ ان کے لیے ریزرو رہی اور انھیں جب بھی موقع ملتا تھا جا کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔

مادھوری کے جنون کو لے کر حسین صاحب ایک زمانے تک بحث کا موضوع بنے رہے کچھ لوگوں نے مذاق اڑایا کچھ نے بدنام کیا ان کے۔ بہت سے دوست اور رشتے دار ناراض بھی ہو گئے کہ ایک ایکٹریس کی تصویریں بنانا اور ان پر اپنے نام کی جگہ "فدا" لکھنا حسین کی عظمت اور وقار پر داغ تھا۔

یہ سلسلہ ایک زمانے تک چلتا رہا۔ مگر انھوں نے کبھی کوئی صفائی دینے کی کوشش نہیں کی یا اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اگر کبھی کوئی ہمت کر کے کچھ پوچھ لیتا تو حسین کے ہونٹوں پر ایک شفیق مسکراہٹ دکھائی دیتی بالکل ایسا لگتا جیسے کوئی بزرگ کسی بچے کے معصوم سوال پر مسکرا رہا ہو۔ صرف ایک انٹرویو میں جو علی کو دیا گیا تھا انھوں نے اپنے اور مادھوری کے تعلق پر بات کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا:

> "میں نے مادھوری دکشت کی شکل میں پہلی بار ایک مکمل عورت کو دیکھا۔
> ایک مکمل ہندوستانی عورت جو ایک ہی وقت میں ٹریڈیشنل بھی اور ماڈرن بھی۔ مجھے اس میں عورت کا ہر روپ دکھائی دیا۔ مجھے اس میں اپنی ماں بھی دکھائی دی جو مجھے ڈیڑھ برس کا چھوڑ کے چلی گئی تھی۔!"

حسین کا مادھوری سے کیا رشتہ تھا یہ سمجھانا بہت مشکل ہے۔ وہ ان کا عشق تھا یا جنون تھا ان کا حسنِ نظر تھا یا مادھوری کا حسن زن؟ کوئی نہیں جانتا سوائے حسین کے۔

سودا جو تیرا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

میرا خیال ہے خود حسین کو بھی اس کا احساس تھا کہ ایک سوال ان کا پیچھا کر رہا ہے اور اسی لیے ان کی دوسری فلم ''میناکشی'' میں ایک گانا ڈالا گیا تھا۔

''یہ رشتہ کیا کہلاتا ہے.......''

اس گیت کو ایک طریقے سے حسین صاحب کا جواب سمجھا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی سوال ہی سوال کا جواب ہوتا ہے۔

گج گامنی کے کچھ عرصے بعد ہی مادھوری نے شادی کر لی تھی اور ہندوستانی فلم انڈسٹری کو چھوڑ کر اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ جا بسی تھی۔! مگر حسین صاحب کے دل میں اسی طرح بسی رہی۔ اس کے جانے کے بعد انھوں نے درجنوں لڑکیوں میں مادھوری کو ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر نہیں ملی۔ افسوس کہ جب مادھوری گیارہ سال بعد ہندوستان واپس آئی تو حسین صاحب یہاں سے جا چکے تھے۔ ہمیشہ کے لیے!

یہ بات کسی حد تک صحیح ہے کہ انھوں نے اپنی پہلی فیچر فلم ''گج گامنی'' مادھوری کے لیے ہی بنائی تھی۔ وہ کہتے تھے۔

> ''جب دل میں فلم بنانے کا خیال آیا تو میں نے اپنے گھوڑے بیچ دیے اور چھ مہینے تک دن رات تصویریں بنا بنا کر سات کروڑ جمع کیے۔ تا کہ گج گامنی بنا سکوں۔''

الجزیرہ کے ایک انٹرویو میں حسین سے پوچھا گیا تھا۔

''آپ نے فلم بنانے میں اتنی دیر کیوں لگائی؟''

حسین کا جواب تھا:

> ''فلم تو میں شروع سے ہی بنانا چاہتا تھا۔ مگر موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس ساٹھ سال میں تیس سال مادھوری کے پیدا ہونے اور جوان ہونے کی وجہ سے بھی دیر ہوئی۔''

فلم سے ان کی دلچسپی بہت پرانی تھی شاید اس زمانے کی جب وہ الفریڈ ٹاکیز کے

پردے رنگا کرتے تھے۔

۱۹۶۷ء میں انھوں نے ایک ڈاکیومنٹری فلم "(Through the eyes of a painter)" بنائی تھی۔ جسے برلن فلم فیسٹول میں گولڈن بیئر ایوارڈ ملا تھا۔ وہ کہتے تھے:

"جب ایوارڈ ملا تو ارادہ کیا کہ اب فلمیں ہی بنائیں گے۔ مگر میرے اندر جو پینٹر تھا وہ جیت گیا۔ اب بھی کبھی کبھی جب پینٹر تھک جاتا ہے تو فلم لے کر باہر آجاتا ہے۔"

کیوں کہ سینما ایک مکمل آرٹ ہے۔ اس میں پینٹنگ ہے، میوزک ہے، ڈانس ہے، ڈراما ہے، ادب اور شاعری ہے اور ٹیکنالوجی بھی ہے۔

انھیں پرانی فلمیں جن میں اچھی کہانی ہوتی تھی اچھا میوزک ہوتا تھا اور اچھے اداکار ہوتے تھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ پرانی فلموں کی ہیروئن سورن لتا، مدھوبالا اور گیتا بالی کی باتیں کرتے وقت آنکھوں میں چمک آجایا کرتی تھی۔ ماسٹر وٹھل ان کا پسندیدہ ہیرو تھا کہتے تھے اس کا جسم اتنا خوبصورت تھا کہ کسی مورتی کار کا بنایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

حسین صاحب کی ایک بڑی مزے دار عادت تھی کہ جب بھی تھک جاتے یا پریشان ہوتے تو ڈرانے والی (Horror) فلمیں دیکھا کرتے تھے اور جس جگہ ڈر سے چیخیں نکلنی چاہئیں وہاں کھل کھلا کر ہنسا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ Horror فلم سے زیادہ کامیڈی اور کہیں نہیں ہوتی۔ فلموں کی بات چل رہی ہے تو ایک آخری بات سنادوں۔ ایک دن کہنے لگے۔

"میں اس پر یقین نہیں رکھتا کہ انسان دوبارہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہے تو میں دوسرے جنم میں راج کپور جیسا ڈائرکٹر بننا چاہوں گا۔"

وہ راج کپور، محبوب خان، کے آصف اور گرودت کے دیوانے تھے ان لوگوں کی فلمیں جہاں کہیں لگتی تھیں، انھیں دیکھنے پہنچ جایا کرتے تھے۔ نئی فلموں میں ان کو مزہ نہیں آتا تھا کہتے تھے وقت کے ساتھ بمبئی کی دو چیزیں بہت خراب ہوگئی ہیں ایک فلم دوسری چائے۔!

فلمیں دیکھنے کا شوق صرف ہندوستانی فلموں تک محدود نہیں تھا۔ غیر ملکی زبانوں اور

ہندوستان میں بننے والی علاقائی فلموں سے بھی انھیں کافی دلچسپی تھی۔ ستیہ جیت رے کو بہت مانتے تھے۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ فلم "چارولتا" دیکھنے کے بعد وہ ستیہ جیت رے سے ملنے کے لیے کلکتہ گئے تھے۔ یہ ملاقات کافی دلچسپ تھی کیوں کہ سلام دعا کے بعد دونوں بہت دیر تک چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر رے صاحب نے ایک کاغذ اٹھایا اسے دو برابر حصوں میں پھاڑا اور ایک حصہ حسین کو دے کر دوسرا اپنے سامنے رکھ لیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کے اسکیچ بنائے اس پر دستخط کیے۔ حسین نے رے کا اسکیچ بڑے ادب سے انھیں پیش کیا اور ان کے ہاتھ سے رے کا بنایا ہوا اپنا اسکیچ لے لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دو عظیم ہستیاں اس سے بہتر طریقے سے ایک دوسرے کو خراج تحسین نہیں دے سکتی تھیں۔

حسین صاحب کی شخصیت بڑی دل آویز تھی۔ دیکھو تو اچھے لگتے تھے اور سنو تو ہر بات دل میں اتر جاتی تھی۔ میں نے انھیں کبھی دکھاوا کرتے نہیں دیکھا۔ نہ کبھی ان کی کسی ادا سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ دنیا کے عظیم مصوروں میں سے ایک ہیں۔ انھیں ہندوستان کا پیکاسو (Picasso) کہا گیا۔ The greatest painter post partition لکھا گیا۔ پدم شری، پدم بھوشن اور پدم وبھوشن کے اعزازات ملے۔ صدر جمہوریہ نے راجیہ سبھا ممبر منتخب کیا۔ ان کی بنائی تصویریں کروڑوں میں فروخت ہوئیں اور ہر بڑی آرٹ گیلری کی زینت بنیں۔

وہ شہرت اور مقبولیت کے ساتویں آسمان پر رہے، مگر ان کا دماغ کبھی آسمان تک نہیں پہنچا اور ان کے پاؤں بلکہ یوں کہنا چاہیے ننگے پاؤں ہمیشہ زمین پر ہی رہے۔ ایک دن میں نے پوچھا تھا۔

"آپ جوتے کیوں نہیں پہنتے؟"

مسکرائے اور آنکھیں چمکا کر بولے۔

"اس لیے کہ زمین سے میرا رشتہ نہ ٹوٹ جائے۔"

وہ بات اگرچہ شاعرانہ تھی مگر مکمل تھی۔ سب جانتے ہیں کہ انھوں نے زمین سے اور زمین کی ہر شے سے اپنے رشتے کو بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ ویسے تو کسی کو نہیں معلوم کہ حسین

نے جوتے کب اور کیوں اتارے۔ لیکن وہ گاندھی جی سے بہت متاثر تھے اور ان پر ایک سیریز بھی بنایا تھا۔ عین ممکن ہے کہ جس طرح گاندھی جی نے غریبوں کی ہمدردی میں کپڑے تیاگ دیے تھے اسی طرح حسین نے بھی جوتے پہننے چھوڑ دیے ہوں۔ ویسے وہ اپنے ننگے پیروں کی ایک وجہ اور بھی بتاتے تھے۔

"سارے Nerves پیروں میں ہوتے ہیں، ننگے پاؤں چلنے سے ان کی مالش ہوتی رہتی ہے (Acupressure) یہی تو میری صحت کا راز ہے۔"

علی نے ایک مزیدار واقعہ سنایا تھا کہ نیشنل سینٹر فار پرفارمنگ آرٹس (NCPA) کے ایکسپری مینٹل تھیٹر میں لبنیٰ اور سلیم عارف کے ڈرامے "خراشیں" کا شو تھا جو گلزار کی کہانیوں اور نظموں سے مرتب کیا گیا تھا۔ حسین صاحب علی کے ساتھ تھیٹر پہونچے تو دیر ہو چکی تھی اور شو شروع ہو چکا تھا۔ دونوں چپ چاپ ایک کونے میں کھڑے ہو کر شو دیکھنے لگے۔ تھیٹر والوں میں سے کسی نے حسین کو پہچانا تو کرسی لا کر رکھ دی۔ مگر حسین صاحب کھڑے رہے۔ علی نے نہ بیٹھنے کی وجہ پوچھی تو بولے۔

"لیٹ آنے کی سزا ملنی چاہیے!"

اور سارا ناٹک کھڑے ہو کر دیکھا۔

حسین صاحب کو کتابیں پڑھنے کا کوئی زیادہ شوق نہیں تھا اور وقت بھی کہاں ملتا تھا مگر وہ اس کمی کو ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میں رہ کر پورا کر لیا کرتے تھے۔ ہندوستان کے کسی بھی شہر میں ہوں اور کسی اچھے مشاعرے ڈرامے یا ادبی محفل کی خبر ملے تو کام چھوڑ کر پہونچ جایا کرتے تھے۔ لندن میں ان کا May Fair والا فلیٹ تو ہندوستانی اور پاکستانی ادیبوں کا اڈا بنا رہتا تھا۔ دن بھر شاعری ادبی بحثوں اور جملے بازیوں میں نکل جاتا۔ شام کو حسین صاحب سب کو سمیٹ کر کسی اچھے ہوٹل یا ریسٹوراں میں لے جاتے اور دل کھول کر خاطر کرتے۔ حسین کی ان ادبی سرگرمیوں کے بہت سے چشم دید گواہ موجود ہیں۔ جن میں ایک مشہور شاعر مصطفیٰ شہاب بھی ہیں جنھوں نے حسین صاحب کی ادب نوازی کے درجنوں قصے سنائے۔ وہ ادیبوں کی کتنی عزت

کرتے تھے اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوگا کہ ایک دن میرے سٹنگ روم پر آئے تو میں کچھ لکھ رہا تھا پوچھا:

"کیا لکھ رہے ہو؟"

میں نے بتایا کہ اپنے نئے ڈرامے "آپ کی سونیا" کو آخری شکل دے رہا ہوں۔ حسین صاحب گاؤ تکیے پر نیم دراز ہو گئے۔ اپنی لمبی لمبی ٹانگیں پھیلائیں اور بولے۔

"کچھ سناؤ!"

میں نے ڈرامہ سنانا شروع کیا۔ وہ آنکھیں چمکاتے، مسکراتے اور سنتے رہے۔ اچانک میری بیوی فریدہ سے جو اتفاق سے وہیں تھیں پوچھا۔

"کوئی سفید کاغذ ہے؟"

فریدہ نے ایک Sheet بڑھادی۔ حسین صاحب نے اسے غور سے دیکھا اور جیب سے اسکیچ پین نکال کر بولے۔

"تم سناتے رہو۔ میں اپنا کام کر رہا ہوں!"

انھوں نے کاغذ پر لکیریں کھینچنا شروع کیں اور میں اپنا ناٹک پڑھتا رہا۔ کوئی بیس منٹ بعد حسین صاحب اچانک سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ میں رک گیا۔

"کیا ہوا؟ میں نے پوچھا۔

جواب میں انھوں نے کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔

"یہ آپ کی سونیا کا پوسٹر ڈیزائن ہے!"

میں نے دیکھا حسین کے اپنے مخصوص انداز میں ڈرامے کے دونوں کردار دکھائی دے رہے تھے اوپر اردو میں "آپ کی سونیا" لکھا تھا اور نیچے حسین کے دستخط تھے۔ یہ پوسٹر آج بھی میرے پاس ہے اور ناٹک کی پبلسٹی میں استعمال ہوتا ہے اور یاد دلاتا ہے اس ادب شناس کی جو حسین تھا۔

حسین صاحب ایسی حرکتیں اکثر کیا کرتے تھے۔ کوئی موضوع دل کو اچھا لگتا تو خود ہی اسکیچ

یا پینٹنگز بنا کے پیش کر دیتے۔ شبانہ اعظمی نے بھوک ہڑتال کی اور جھونپڑوں میں رہنے والوں کے لیے حکومت کو چنوتی دی تو حسین صاحب خوش ہو گئے اور شبانہ کا ایک پورٹریٹ بنایا جس میں انھیں شیر پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا تھا اور گھر جا کے شبانہ کو پیش کر دیا۔ یہ اظہار تحسین کا حسینی انداز تھا مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حسین صاحب کو اپنی قدر و قیمت کا اندازہ نہ تھا۔ میرے سامنے کی بات ہے کہ کلکتہ کے ایک اسکول نے فنڈ جمع کرنے کے لیے حسین صاحب سے مدد مانگی۔ حسین نے اسکول کی پرنسپل سے کہا:

"یہ پینٹنگ، پانچ لاکھ سے کم میں نہیں جانی چاہیے۔ اگر اس سے کم کی بولی لگے تو پینٹنگ واپس لے آنا اور پانچ لاکھ مجھ سے لے جانا۔"

پھر زور سے ہنسے اور فرمایا:

"حسین ایک برانڈ کا نام ہے۔ اسے سستا نہیں بیچا جا سکتا۔!"

یہ تیور ایک طرف تھے دوسری طرف یہ حال تھا کہ چاہنے والوں کو بھی اپنی تصویریں یونہی اٹھا کر دے دیا کرتے تھے۔ میں نے ایک ہیروئن کے سکریٹری کے گھر میں ان کی درجنوں شاہ کار پینٹنگز لگی دیکھی ہیں پتہ نہیں ہیروئن کے گھر کا کیا حال ہوگا۔

نادرہ ظہیر ببر کی دیوار کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ ہوا یوں کہ نادرہ اپنے نئے بنگلے میں آئیں تو حسین صاحب بھی انھیں مبارکباد دینے پہنچے۔ ہال کی سفید دیوار میں خدا جانے انھیں کیا نظر آیا کہ کھڑے ہو گئے اور بولے میں اس پر Mural بناؤں گا۔ نادرہ اور راج ببر کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انھوں نے کہا:

"زہے نصیب۔"

حسین صاحب نے دیوار پر اپنے موٹے کالے قلم سے کچھ لکیریں کھینچیں اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ اگلی دفعہ آؤں گا تو رنگ بھر دوں گا۔ مگر کوئی ڈیڑھ سال تک نہیں پلٹے۔ پھر اچانک ایک دن رنگوں کے ساتھ آئے اور آدھی تصویر میں رنگ بھر کے چلے گئے۔ اب انھیں کون کہتا کہ کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑنا چاہیے، حسین صاحب کئی مہینے بعد پھر واپس آئے کچھ اور رنگ بھرے

اور غائب ہو گئے۔ نادرہ کا کہنا ہے کہ ان کی دیوار کی تصویر کئی برس میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مکمل ہوئی۔ مگر ان کے گھر میں آج بھی حسین صاحب کی دوست نوازی کی یادگار بنی ہوئی ہے۔

جب علی نے مجھے بتایا کہ حسین صاحب یش چوپڑہ کے اسٹوڈیو کی ساٹھ فٹ اونچی دیوار پر Mural بنانے کے لیے بانس کی بنی ہوئی مزدوروں والی سیڑھی پر چڑھ گئے تھے تو میں نے پوچھا تھا۔ آپ کو ساٹھ فٹ کی اونچائی پر بغیر کسی سہارے کے کام کرتے ہوئے ڈر نہیں لگا؟ حسین صاحب نے مسکرا کے ایک چٹخارا لیا جیسے کھٹی میٹھی گولی کا مزہ لے رہے ہوں۔ پھر بولی:

"مائیکل اینجلو نے سینٹ پیٹرز کی چھت رسی پر لٹک کر پینٹ کی تھی۔
میرے پیروں کے نیچے تو سیڑھی تھی...... چیلینج ہو تبھی کام کا مزہ آتا ہے!"

کیفی صاحب اور شوکت آپا کی شادی کی سال گرہ پر انھوں نے اپنا ایک اور کمال دکھایا تھا۔ بھرے جلسے میں ایک شخص کیفی صاحب کی نظم پڑھتا جا رہا تھا اور حسین صاحب کینوس پر کیفی کے تصور کو تصویر میں ڈھال رہے تھے۔ یہ کیفی صاحب کو شادی کی سال گرہ کا تحفہ نہیں تھا۔ ان کی شاعری کو سلام تھا۔ حسین کی اردو خاصی اچھی تھی۔ اپنے دوست طیب مہتہ کی تصویروں کی نمائش دیکھ کر انھوں نے لکھا تھا۔

> "حرف الف جب بے جا خودداری قامت کی وجہ سے محسوس کرنے لگا کہ اسے وقت اور مقام سے کوئی واسطہ نہیں تو غیر ارادی طور پر اپنے پیر تلے کی زمین کھو بیٹھا۔ بھلا حرف الف ایسے ماحول میں صحیح سلامت کھڑا رہ سکے۔ وہ شکل وہ ہیئت اگر استحکام چاہتی ہو تو لازمی ہے کہ اپنے وجود کے حصوں میں تبدیلی پیدا کرے۔ صحیح مقدار اور نئے زاویوں میں ڈھال لے جو اطراف کی سہمی ہوئی سطح سے منسلک ہو۔ تب کہیں وہ ڈھانچہ انسانی معانی اور قدریں لے کر ابھر سکتا ہے۔"

اردو میں لکھا ہوا ان کا یہ تبصرہ طیب مہتہ کی سوانح میں شامل ہے۔

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حسین گھوڑوں اور عورتوں کے پینٹر ہیں۔ اگر ایک مصور کی

نظر سے دیکھا جائے تو دونوں موضوعات اتنے وسیع ہیں کہ کوئی بھی مصور ان کے خطوط، زاویوں اور رنگا رنگی میں خود کو گم کر سکتا ہے۔ گھوڑا جو قوت اور ہمت کا نشان ہے عورت جو حسن اور نزاکت کا طلسم ہے۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ حسین صاحب کے برش نے سیکڑوں دوسرے موضوعات کو چھوا ہے اور انھیں امر کر دیا ہے۔ وہ کہتے تھے:

"تصویر میں ڈراما ہونا چاہیے اور یہ تب تک ممکن نہیں ہے جب تک سبجکٹ میں ڈرامانہ ہو۔!"

رامائن، مہابھارت، مہاتما گاندھی، مدر ٹریزا ان کے لازوال سیریز ہیں ان کا ایک سیریز اور بھی ہے جس کے بارے میں بہت کم لوگوں کو علم ہے۔

جس زمانے میں حسین صاحب راجیہ سبھا کے ممبر تھے اور لمبی لمبی تقریریں سن کر بور ہوا کرتے تھے انھوں نے دل بہلانے کا ایک راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنی بینچ پر بیٹھے لیڈروں کے اسکیچ بنایا کرتے تھے مگر کسی کو دکھاتے یا دیتے نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے جب روی شنکر، امرتا پریتم اور میں پارلیمنٹ میں بیٹھا کرتے تھے تو بالکل ایسا لگتا تھا جیسے تین اناڑی پالیٹکس کا ہول سیل بیوپار کرنے والوں کے بیچ میں بیٹھے ہوں۔ سیاست دانوں کے یہ اسکیچ سیکڑوں کی تعداد میں ہیں اور کسی کو معلوم نہیں کہ یہ بیش بہا خزانہ کس کے پاس ہے۔

اپنے آخری دنوں میں ایک سیریز "عرب تہذیب کے ہزار سال" پر کام کر رہے تھے۔ جو قطر کے نیشنل میوزیم میں لگایا جانے والا تھا۔ اس میوزیم کے لیے حسین صاحب کانچ کے گھوڑے بھی بنا رہے تھے جن کا قد اصلی گھوڑوں کے برابر تھا اور کاروں سے پیدا ہونے والی مختلف آوازوں کو ملا کر میوزک بھی بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ شاید اس لیے کہ مقبول فدا حسین کے اندر جو بچہ تھا اس کی معصومیت اور حیرانی کبھی کم نہیں ہوئی۔ وہ ساری زندگی اسی حیرت میں مبتلا رہے جو نئی چیزوں کو دیکھنے چھونے، جاننے اور حاصل کرنے کی ترغیب دیتے۔! غالب نے شاید انھیں کے لیے کہا تھا۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

حسین کو اپنے ہندوستان سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ انھیں اپنے ملک کی ہر ادا اچھی لگتی تھی۔ یہاں کے لوگ، بولیاں، کپڑے، میوزک، عمارتیں، ندیاں، پہاڑ، ریگستان، رنگ بدلتی ہوئی مٹی۔

زفرق تا بہ قدم، ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

(سر سے پاؤں تک جہاں کہیں بھی دیکھتا ہوں نظر دل کا دامن پکڑ کے کہتی ہے یہی تو دیکھنے کی چیز ہے۔)

کتنی حیرت کی بات ہے کہ اپنے ملک سے محبت ہی حسین کا جرم بن گئی۔ رہبری کے نام پر رہزنی کرنے والے لیڈروں نے ہندوستان کی جو حالت بنا رکھی تھی اس پر ہر وطن پرست کی طرح حسین صاحب کا دل بھی تڑپتا تھا۔ اس گندی سیاست اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف انھوں نے اپنا احتجاج اس طرح درج کیا کہ ایک اُداس پریشان حال بھارت ماتا کو چیتھڑوں میں لپٹا ہوا دکھایا۔ چوٹ گہری تھی اور عالمی توجہ حاصل کر رہی تھی اس لیے فرقہ پرستوں کو اچکایا گیا اور حسین پر الزام لگا کہ انھوں نے دیوی دیوتاؤں کی توہین کی ہے اور ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو بھڑکایا؟ ان کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا۔ حسین نے اپنی صفائی میں کہا:

> ''بھارت ماتا کوئی دیوی نہیں ہے۔ نہ اس کی پوجا ہوتی ہے۔ وہ تو ایک تصور ہے۔ ہر انسان اپنے وطن کو اپنی ماں کہتا ہے۔ اس رشتے سے بھارت بھی ہم سب کی ماں ہے اور کوئی اپنی ماں کو کیسے ذلیل کر سکتا ہے؟''

دہلی ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا کہ پینٹنگ میں گندگی اور عریانی نہیں ہے اور حسین صاحب بے قصور ہیں مگر۔

تیغ منصف ہو جہاں، دار و رسن ہوں شاہد
بے گناہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا

چناں چہ احمد آباد میں واقع ان کا میوزیم جلا دیا گیا۔ گھر پر پتھراؤ ہوا۔ قتل کی دھمکیاں دی گئیں اور ملک کے تقریباً سو شہروں میں ان کے خلاف مقدمے دائر کیے گئے۔ بہت سی عدالتوں نے وارنٹ جاری کیے۔ جن میں سے کئی ایسے تھے کہ ضمانت بھی نہیں ہوسکتی تھی اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ انھوں نے اس ہندوستان کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا جس سے انھیں بے پناہ عشق تھا اور جس کو آزادی ملنے پر وہ رات بھر سڑکوں پر ناچتے اور لوگوں سے گلے ملتے رہے تھے۔ انھوں نے کہا۔

''میں جارہا ہوں اور اب اسی وقت لوٹوں گا جب میری بے گناہی ثابت ہوجائے گی!''

مگر حسین کی بے گناہی کا مطلب تھا اصلی گناہ گاروں کے چہرے سے نقاب اٹھانا۔ مگر نقاب کون اٹھاتا؟ ہندوستان کا پکاسو، دنیا کے ۲۰ عظیم ترین مصوروں میں سے ایک مقبول فدا حسین برسوں بھٹکتا رہا۔

سر کوئے ناشناساں ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

۲۰۰۶ء میں انھیں قطر کی شہریت مل گئی۔ مگر ان کی بے چین روح وطن کے لیے تڑپتی رہی اور ۹؍جون ۲۰۱۱ء کو وہ کہانی ختم ہوگئی جو الفریڈ ٹاکیز کے پیچھے ایک گلی سے شروع ہوئی تھی اور جس میں اتنے ہی رنگ ہیں جتنے حسین کی تصویروں میں ہوتے ہیں۔ انتقال سے کوئی آٹھ مہینے پہلے انھوں نے مجھے اجوا کھجوروں کا ایک ڈبا بھجوایا تھا۔ میں نے شکریہ ادا کرنے کے لیے فون کیا اور پوچھا:

''آپ انڈیا کب آرہے ہیں؟''

جواب ملا:

''جب آپ بلائیں!''

یہ حسین صاحب کی آخری آواز تھی جو میں نے سنی تھی!

کیفی صاحب۔لال سلام

مستان تالاب کا میدان لال جھنڈوں سے دہک رہا تھا۔رات آدھی سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اوس بھی گرنے لگی تھی مگر کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے کو تیار نہیں تھا۔سڑک پار کی عمارتوں کی کھڑکیوں اور بالکنیوں میں دوپٹوں اور اوڑھنیوں سے ڈھکے ہوئے سیکڑوں سر اس طرح دِکھائی دے رہے تھے جیسے فریم میں جڑ دیے گئے ہوں اور آس پاس کی سڑکیں دیکھنے والوں سے ایسی کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں کہ سواری تو چھوڑیے انسانوں کے گزرنے کی جگہ بھی باقی نہیں تھی۔اس زمانے میں کمیونسٹ پارٹی کے جلسے ایسے ہی ہوا کرتے تھے۔(وہ بھی کیا زمانہ تھا) مقررین کچھ اس طرح بول رہے تھے کہ گرجدار اور دھواں دھار جیسے الفاظ کم مایہ معلوم ہوتے تھے۔مَیں اسٹیج کے پاس ایک بہت نیچی سی کرسی پر بیٹھا اپنا بال پین بار بار جھٹکتا تقریروں کے notes لے رہا تھا۔انگلیاں اتنی تیزی سے چل رہی تھیں جتنی ان میں طاقت تھی۔اچانک وہ صاحب جو بہت دیر سے سرمایہ داروں کو گھونسے دِکھا رہے تھے،خاموش ہو گئے۔مجمع میں بھی ہلکی سی ہلچل نظر آئی۔بہت سے لوگ کھڑے ہو کر اسٹیج کی پچھلی طرف کسی کو دیکھ رہے تھے۔اسٹیج کے پیچھے بنی ہوئی لکڑی کی سیڑھیوں پر پہلے ایک سر نمودار ہوا،اور پھر ایک دھڑ،بکھرے ہوئے بڑے بڑے بال،پسینے سے بھیگا ہوا چہرہ،موٹی موٹی آنکھوں میں تھکان کی سُرخی،سفید رنگ کا ڈھیلا ڈھالا کرتا اور بڑے پائچوں کا لکھنوی پاجامہ۔لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا:

"کیفی صاحب.... کیفی اعظمی.... کامریڈ کیفی....!"

کچھ نوجوانوں نے نعرہ لگایا:

"لال سلام.... لال سلام.... کیفی صاحب لال سلام، انقلاب زندہ باد"

کیفی صاحب نے ہاتھ ہلا کر لال سلام کا جواب دیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ صاحب جو کیفی کے احترام میں بولتے بولتے رُک گئے تھے، پھر بولنے لگے مگر تقریر جلدی سے ختم کردی، کیوں کہ کیفی صاحب کو ایک اور الیکشن میٹنگ میں بھی جانا تھا۔ مَیں نے کیفی کا نام بہت سنا تھا، کلام بھی پڑھا تھا مگر دیکھا نہیں تھا۔ اگر آنکھ ناک کو الگ الگ کر کے دیکھا جائے تو وہ کوئی ایسے حسین نہیں تھے۔ بدن بھی بھاری تھا، قد بھی بہت لمبا نہیں تھا۔ کوئی پانچ فٹ نو یا دس انچ رہا ہوگا، مگر ان کی شخصیت میں ایک عجیب سی کشش تھی، جو محسوس تو کی جاسکتی ہے بیان نہیں کی جاسکتی.... اور آواز.... الامان!.... مومن نے سچ مچ کسی غیرتِ ناہید کی آواز میں شعلے لپکتے دیکھے تھے یا نہیں وہ تو معلوم نہیں.... مگر مَیں نے ضرور دیکھے ہیں، کیفی کی آواز میں!

جس رات کا ذکر کر رہا ہوں، مَیں اپنے اخبار کے لیے رپورٹ لینے گیا تھا، مگر جب کیفی صاحب نے بولنا شروع کیا تو مَیں لکھنا ہی بھول گیا۔ دفتر جا کر کچھ سنی سنائی اور کچھ اپنی طرف سے گڑھ کر ایک رپورٹ بنادی اور کیفی کا نام ڈال دیا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس زمانے میں بھی لوگ الیکشن کی تقریروں کو نہ غور سے سنتے تھے اور نہ دھیان سے پڑھتے تھے۔ اس لیے کسی نے نہیں پوچھا کہ کیفی کی تقریر کیفی کی تھی یا میری، اور جان بچ گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مَیں سوشلزم کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اور مارکسزم پر بہت سی کتابیں جو انگلش یا روسی زبان سے اردو میں ترجمہ کی گئی تھیں Peoples Publishing House (PPH) سے خرید کر لے آیا تھا۔ مگر وہ کتابیں ایسی جناتی زبان میں تھیں کہ لاکھ کوشش کے باوجود سمجھ ہی میں نہیں آتی تھیں۔ "جدلیاتی مادیت۔ استعماری فشار؟؟؟...." پڑھ کر تو پاؤں بھی ٹھنڈے ہوجاتے تھے۔ جو تھوڑا بہت مارکسزم سمجھ میں آیا وہ احسان اردو کے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا تھا۔ فیضؔ، سردار جعفری، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، عصمت چغتائی کو پڑھ کر ترقی پسندی کا جو مفہوم سمجھ میں آیا وہ PPH کی کسی کتاب سے نہیں آیا۔

اس فہرست میں کیفی صاحب سرِفہرست ہیں کیوں کہ انھوں نے نہ تو اپنے بہت سے ہم عصروں کی طرح بے خواب دریچوں پر رنگین پردے ڈالے اور نہ ہی کچرے کے ڈھیر کو اس طرح کریدا کہ بدبو سے دم گھٹنے لگے۔ کیفی مجھے اس لیے بھی اچھے لگتے تھے کہ ان کی بات ناپختہ اور ناتجربے کار ذہنوں میں بھی آسانی سے اُتر جاتی تھی۔

لبالب ہیں کہیں ساغر، کہیں خالی پیالے ہیں
یہ کیسا دور ہے ساقی، یہ کیا تقسیم ہے ساقی

ترقی پسند تحریک ایک عظیم انقلاب تھا۔ ایک ایسا انقلاب جس کو سمجھنے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ درد کی طرح دبے پاؤں رگوں میں اُتر جاتا ہے اور پھر کبھی نہیں نکلتا۔ مجھے ایسے لوگ بالکل اچھے نہیں لگتے جنھیں پڑھ کر لگتا تھا کہ ترقی پسندی کوئی تحریک نہیں "رسالہ شمع" کا معمہ ہے، جسے حل کرنے پر انعام ملتا ہے۔

کیفی صاحب کمیونسٹ پارٹی کے فُل ٹائم ورکر تھے اور پارٹی کے حکم پر بہت سے ٹریڈ یونینوں کی سرگرمیوں میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مدن پورہ، مومن پورہ، سات رستہ، بائیکلہ، لال باغ اور پریل ملوں اور مزدوروں کے علاقے تھے۔ بہت سی کپڑا ملیں تھیں اور سینکڑوں بنکر مشینوں اور ہتھ کرگھوں پر کام کرتے تھے۔ یہی علاقے کیفی صاحب کی سرگرمیوں کا مرکز تھے۔

مومن پورہ کا عوامی ادارہ انھیں کی کوششوں سے قائم ہوا تھا اور ایک زمانے تک سینٹرل ممبئی میں بائیں بازو کی تمام تحریکات کا نشان بنا رہا تھا۔ عوامی ادارہ اب بھی ہے مگر کونے میں پڑی ہوئی بوسیدہ کتاب کی طرح، جسے دیکھتے سب ہیں مگر پڑھتا کوئی نہیں۔ ہاں تو اسی عوامی ادارے میں کیفی صاحب سے میری پہلی تفصیلی ملاقات ہوئی تھی۔ کوئی جلسہ ہونے والا تھا اور شروع ہونے میں دیر تھی تو مَیں انھیں گھیر بیٹھا اور انٹرویو جیسا لے ڈالا۔ اب یاد نہیں کہ مَیں نے کیا پوچھا اور انھوں نے کیا جواب دیا، مگر یہ ضرور یاد ہے کہ جلسوں اور مشاعروں میں جنگل جگا دینے والے کیفی صاحب روزمرہ کی بات چیت میں سوچ سوچ کر اور رُک رُک کر بولتے تھے۔ لوگ عام طور

پر جھوٹ بولتے وقت سوچتے ہیں مگر وہ سچ بھی سوچ کر بولا کرتے تھے۔

اس کے بعد کیفی صاحب سے بہت سی ملاقاتیں ہوئیں اور ان کے بارے میں بہت سی باتیں بھی معلوم ہوئیں۔ پتہ چلا کہ شاعری اور سیاست ہی وہ میدان نہیں جن میں ان کا طوطی بولتا ہے بلکہ ممبئی میں اچھے اور بامعنی تھیٹر کا چراغ بھی جلائے رکھنے والے کیفی صاحب ہی ہیں۔

وہ انڈین پیوپلس تھیٹر اسوسی ایشن کے روحِ رواں تھے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ IPTA ترقی پسند تحریک کا ہی ایک چہرہ تھا اور نہ یہ وجہ تھی کہ اس پر کمیونسٹ نظریات کا بہت گہرا اثر تھا۔ بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ ڈراموں سے کیفی صاحب کو ذاتی دلچسپی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ شعر یا ادب صرف ان لوگوں کو متاثر کرسکتا ہے جو اسے پڑھ سکتے ہیں۔ جب کہ ڈراما ان لوگوں تک بھی پہنچ جاتا ہے جو پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتے۔ اس کا اثر بھی بہت دور تک ہوتا ہے اور دیر تک رہتا ہے۔

آج کی طرح اس زمانے میں بھی ناٹک کرنے کے لیے اچھے تھیٹر ہال نہیں تھے اور جو تھے وہ بہت کم تھے۔ زیادہ تر میں ڈراما کرنے کی سہولتیں بھی حاصل نہیں تھیں۔ مگر اپٹا جس مقصد سے وجود میں آیا تھا اس کے لیے کوئی روکاوٹ اتنی بڑی ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ اس کا راستہ روک لے، چناں چہ ہوتا یہ تھا کہ آڈیٹوریم کیسا بھی ہو، کہیں بھی ہو بلکہ نہ بھی ہو تو اپٹا والے پہنچ جاتے تھے۔ کوئی میدان ہو، کسی مل کا کمپاؤنڈ ہو یا کوئی بند گلی ہو، ناٹک کرنے سے کام.... وہ لوگ جو اپٹا میں شامل تھے، پیسے والے نہیں تھے اور نہ پارٹی کوئی مالی مدد کرتی تھی۔ اس لیے یہ ہمیشہ سے غریبوں کی ناٹک کمپنی رہی ہے۔ بے چاروں کو تھیٹر کبھی بھی آسانی سے نہیں ملتا تھا، مگر جو جگہ بھی ملتی اس میں بھان متی کا پٹارہ کھل جاتا تھا۔ سندرا بائی ہال، بھارتیہ ودّیا بھون، چھبیل داس ہائی اسکول، جے ہند کالج اور باندرہ رنگ مندر کے اسٹیج پر بہت سے ناٹک کھیلے گئے۔ ان تمام جگہوں میں تیج پال ہال سب سے اچھا تھا۔ ایرکنڈیشنڈ تھا، اسٹیج بھی کافی بڑا تھا اور خاص بات یہ کہ سینٹرل ممبئی میں تھا جس کے آس پاس کے علاقوں میں پارٹی کا اچھا خاصا اثر بھی تھا۔ یہ ہال اب بھی ہے اور خوش نصیب ہے کہ اس میں اپنے وقت کے بہترین ڈراموں اور عظیم اداکاروں کو اپنے اسٹیج پر دیکھا ہے۔ تیج پال

چوں کہ میرے آفس کے قریب تھا اس لیے مَیں اکثر چلا جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو شو سے پہلے ہی پہنچ جاتا اور ریہرسل دیکھتا یا اپٹا والوں سے باتیں کرتا رہتا۔ تِن سیٹھی نے جو اس زمانے میں اپٹا کے سکریٹری تھے، مجھ سے کہا:

"آپ ہمارے ہر ناٹک کا ریویو چھاپتے ہیں، اگر ان کا اعلان بھی اخبار میں دے دیا کریں تو کتنا اچھا ہو۔!"

میرے لیے ہفتے، پندرہ دن میں چار، چھ انچ کی جگہ اپٹا کو دے دینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اس لیے میرے اخبار 'اردو رپورٹر' میں تمام ناٹکوں کے اشتہارات پابندی سے شائع ہونے لگے۔ تِن سیٹھی نے اشتہار کا بل ادا کرنے کی بات نکالی تو مَیں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ اشتہارات میری طرف سے اپٹا کو ڈونیشن ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب بھی جاتا آؤ بھگت کچھ زیادہ ہی ہوتی۔ اس دور کے اپٹا والوں میں سے کسی میں بھی اپنی حیثیت کا غرور یا برتری کا احساس نہیں تھا.... خواجہ احمد عباس، بلراج ساہنی، کیفی اعظمی، شوکت کیفی، اے کے ہنگل، دینا پاٹھک، من موہن کرشن، وشوامتر عادل اور ساگر سرحدی وغیرہ اس طرح ملتے تھے جیسے کوئی فرق ہی نہ ہو.... نہ عمر کا نہ علم کا اور نہ رتبے کا۔ تیج پال کے باہر سفید پتھر کی ٹھنڈی منڈیروں پر بیٹھے بیٹھے مَیں ان لوگوں کو دیکھتا اور سنتا رہتا تھا جو دوسروں کو کتابوں اور رسالوں میں ہی نظر آیا کرتے تھے۔

ایسی ہی کوئی شام تھی جب کیفی صاحب نے مجھ سے پوچھا:

"تم تو رام پور کے رہنے والے ہو نا؟"

"جی ہاں!"۔

مَیں نے عرض کیا۔ کہنے لگے:

"بمبئی میں تو بہت سے رام پور والے ہیں، تم جانتے ہو سب کو؟"

مَیں نے کہا:

"سب کو تو نہیں پھر بھی کافی لوگوں کو جانتا ہوں"

"تم مجھے ان کے پاس لے چلو۔"

مَیں اچھل پڑا:

"آپ رام پور والوں کے پاس جائیں گے؟.... کیوں؟" وہ مسکرائے۔

"اپٹا کے لیے سب لوگ اتنا کرتے ہیں، مجھے بھی تو کچھ کرنا چاہیے.... اُن کے پاس جاؤں گا اور چندہ مانگوں گا، تم ساتھ ہو گے تو تمھارے شہر والے کچھ نہ کچھ تو دے ہی دیں گے۔"

نل بازار سے ڈونگری تک اور محمد علی روڈ سے ماہم تک میرے سینکڑوں ہم وطن مقیم تھے۔ ان میں نوکری پیشہ بھی تھے، تاجر بھی تھے، ایک بہت بڑی تعداد لکڑی کا فرنیچر بنانے اور بیچنے والوں کی تھی۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جو دو نمبر کا دھندا کرتے تھے۔ ان لوگوں کو رام پور کی زبان میں: "خفیہ فروش" کہا جاتا تھا۔

چھوٹے چھوٹے کارخانے داروں نے کیفی اعظمی کو اپنی دوکان پر دیکھا تو ان کی خوشی اور حیرانی دیکھنے کی تھی.... مزید حیرت کی بات یہ کہ مجھے کہیں بھی نہیں کہنا پڑا:

"یہ کیفی اعظمی صاحب ہیں۔"

جس نے دیکھا فوراً پہچان لیا.... وہ اپنا تعارف آپ تھے۔

وہ منظر دیکھنے کا ہوتا جب کیفی صاحب ڈراموں کی ضرورت، ان کے فائدے اور اپٹا کی اہمیت سمجھاتے ہوتے اور لکڑی کا کاروبار کرنے والا ایک بے چارہ ترخان نہایت ادب سے سننے اور سمجھنے کی کوشش اس طرح کرتا ہوا نظر آتا جیسے کی اناڑی تیراک پانی سے باہر آنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک تو ویسے ہی اردو ہندی میں ڈراما کرنے اور دیکھنے کا چلن نہیں تھا۔ اوپر سے اپٹا کا نام.... زیادہ تر لوگ سوچتے تھے کہ ڈرامہ تو دکھاوا ہے، کمیونسٹ پارٹی کا پروپیگنڈہ کریں گے۔ حالاں کہ اس زمانے میں جو ناٹک ہوئے وہ پارٹی کا پروپیگنڈہ نہیں تھے۔ بلکہ ہندوستانی تھیٹر میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ تو اس ڈرامے بازی کا مطلب کچھ اور ہی نکالتے تھے۔ مثلاً اعلیٰ درجے کی کرسیاں بنانے والے یامین بھائی نے مجھ سے پوچھا:

''ارے بھائی جاوید میاں، ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس عمر میں کیفی اعظمی کو ایکٹنگ کرنے کی کیا سوجھی ہے؟''

مَیں نے کہا:

''وہ ایکٹنگ نہیں کرتے ہیں۔ ناٹک بھی خود نہیں کرتے، کراتے ہیں۔''

یامین بھائی نے بات کو سمجھ کر سر ہلایا اور فرمایا:

''اچھا اچھا، پیسے پانی کی تکلیف ہوگی.... ہاں اور کیا شاعری سے پیٹ تھوڑی بھرتا ہے....''

یہ اور اس قسم کی بہت سی باتوں کے باوجود کافی پیسے اکٹھے ہوجاتے تھے اور اپٹا کا گھاٹا کچھ کم ہوجایا کرتا تھا۔ اس سلسلے کا ایک چھوٹا سا قصہ سننے کے قابل ہے:

حامد خان مرحوم نے جن کا کارخانہ ڈونگری پر تھا، کیفی صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ تیج پال ہال جائیں گے اور ناٹک ضرور دیکھیں گے۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے مجھے بلایا اور پورے سو روپے اپٹا کے لیے عنایت کیے اور ناٹک کی بے حد تعریف کی، کہنے لگے:

''کیا ڈراما تھا، یار ہنس ہنس کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔''

مَیں حیران ہوا کہ اپٹا کا ایسا کون سا ناٹک ہے جو پیٹ میں بل ڈال دے؟.... پتہ چلا کہ حامد بھائی تیج پال گئے تھے اور پتہ نہیں کس کی کوئی گھٹیا سی کومیڈی دیکھ کر چلے آئے تھے.... کیفی صاحب نے سنا تو بہت ہنسے، کہنے لگے:

''حامد خان سے کہنا، ناٹک کسی کا بھی دیکھیں، چندہ اپٹا کو دیتے رہیں''

یہ سلسلہ کئی مہینے جاری رہا۔ جب کبھی وقت ملتا ہم دونوں گلی کوچوں کی خاک چھاننے کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ اپٹا کا بھلا کبھی ہوتا کبھی نہ ہوتا۔ مگر میرا بھلا مسلسل ہوتا رہا۔ مجھے کیفی صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے، جاننے اور سمجھنے کا پورا موقع ملا۔

اس بمبئی نوردی اور کوچہ گردی کے دوران ہم دونوں میں خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ ادب و احترام اپنی جگہ پر، مگر ایسا لگتا تھا جیسے ہم دونوں دوست بن چکے ہیں۔ لیکن ایک دن انھوں

نے مجھے حیران کر دیا۔ کہنے لگے: ”بھائی جاوید تم بہت اچھے اور کام کے آدمی ہو، مَیں سوچتا ہوں تم سے دوستی کر لینی چاہیے۔“ مَیں ہنسا، اور عرض کیا:

”کیسی باتیں کرتے ہیں کیفی صاحب، کیا ہم دوست نہیں ہیں؟“

کیفی صاحب نے میری آنکھوں میں دیکھا اور بہت سنجیدگی کے ساتھ نا میں گردن ہلا کر بولے:

”دوستی کے لیے ضروری ہے کہ ہم ساتھ میں بیٹھیں، کھانا کھائیں اور شراب پئیں۔“

”آپ کے ساتھ بیٹھنا اور کھانا تو میرے لیے عزت کی بات ہے، مگر شراب....؟“

”وہ تو پینی پڑے گی.... شراب بہت عمدہ چیز ہے، شخصیت پر پڑے ہوئے سارے پردے اٹھا دیتی ہے پھر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ کون دوستی کے قابل ہے۔“

میں تب تک عادی شرابی نہیں تھا۔ کبھی کبھار ایک آدھ بیئر یا کسی اڈے پر نوٹا نک کا گنہ گار تھا۔ اور کیفی صاحب ان لوگوں میں سے تھے، جو ہر شام بوتل سے کہا کرتے تھے:

”کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں“

حالاں کہ شرط کڑی تھی مگر انعام بھی تو بڑا تھا۔ میں مان گیا۔ شہر کے شور سے دور سمندر کے قریب، ایک گاؤں جیسے علاقے جوہو میں کیفی صاحب کا گھر تھا۔ میں باہر کھڑے ہو کر دیر تک بڑی عقیدت سے دیکھتا رہا۔ لکڑی کی دیواروں اور کھپریل والا وہ کاٹیج کسی غزل کے شعر یا نظم کے عنوان کی طرح خوبصورت نہیں تھا مگر اس کی سادگی میں ایک عجیب سا وقار تھا، تقریباً ویسا ہی جیسا کیفی صاحب کی شخصیت میں تھا۔

گہری ہری گھاس اور پھول دار پودوں والا ایک چھوٹا سا لان تھا اور پھر بانس کی جالی والا برآمدہ۔ جس میں ایک صوفہ، کچھ بید کی کرسیاں اور اینٹوں کی ایک منڈیر جیسی تھی جس پر گندے

رکھ کر بیٹھنے کے قابل بنا دیا گیا تھا۔ اس برآمدے کے بیچوں بیچ ایک ناریل کا پیڑ بھی تھا جو کھپریل سے نکل کر اوپر چلا گیا تھا.... کم ہوتے ہیں ایسے لوگ جو اپنی ضرورت کے لیے کسی جاندار کا سر نہیں کاٹتے۔ چاہے وہ پیڑ ہی کیوں نہ ہو۔

شوکت آپا نے کچھ زیادہ ہی تکلف سے کام لے لیا تھا۔ میز میرے پسندیدہ کھانوں سے بھری ہوئی تھی۔ بریانی سے لے کر بگھارے بیگن تک اور دہی بڑوں سے دھوئی دال تک ہر چیز "ہل من مزید" کہہ رہی تھی، مگر برا ہو اس وہسکی کا جو میری شخصیت پر پڑے ہوئے پردے اُتارنے کے لیے اصرار کے ساتھ پلائی گئی تھی۔ اس لیے کھانے کا مزا اتنا نہیں آیا جتنا آنا چاہیے تھا۔ پھر بھی یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ میرے اندر اچھے شرابیوں کی کچھ خوبیاں موجود ہیں۔ جن سے مَیں اب تک واقف نہیں تھا۔ مثلاً یہ کہ نشے کی حالت میں جھگڑا لڑائی یا اپنی بڑائی نہیں کرتا بلکہ چپ ہو جاتا ہوں، نہ ہی مذہب اور سیاست پر بحث کرتا ہوں جو شرابیوں کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔

اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ وہ دعوت بس ایک دعوت ہی تھی جسے کیفی صاحب نے مزے لینے کے لیے میرے امتحان کا نام دے دیا تھا، مگر یہ بھی ممکن ہے وہ سنجیدہ رہے ہوں.... کیفی کی اپنی شخصیت کے دبیز پردوں کو اُٹھانا آج بھی آسان نہیں ہے۔

بظاہر کیفی صاحب بہت کم گو اور کم آمیز تھے۔ اکثر اوقات تو آنکھیں زیادہ بولتی تھیں، ہونٹ کم۔ لوگوں سے میل جول کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ یوں ملنے کو تو جس سے ملتے بڑی محبت اور ایک بڑی سی مسکراہٹ کے ساتھ ملتے۔ مگر اس مسکراہٹ کے پار جانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ اندر ایک طلسمِ در بند تھا جس کے دروازے دیر سے کھلتے تھے اور مشکل سے بھی۔ پھر بھی ان کے چاہنے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ طرح طرح کے لوگ تھے اور بھانت بھانت کے رشتے۔ کوئی شاعری کا شیدا تھا، تو کوئی ان کا نظریاتی مرید، کوئی علم و فضل سے بیعت اور کوئی ان کی شخصیت سے مرعوب تھا۔ ان میں ہم جیسے بھی بہت سے تھے جنھیں اپنے کیفی صاحب ہر روپ میں اچھے لگتے تھے۔

ایک زمانہ تھا کہ قلم کاروں کو اس محدود روشنی ہی میں دیکھا جاتا تھا جو ان کے قلم سے

پھوٹتی تھی۔ مگر زمانہ بدلا اور لوگوں نے جھانکنا شروع کیا تو دراروں کے بیچ منہ بھی نظر آنے لگے اور پتہ چلا کہ اونچے اسٹیج پر بیٹھ کر اونچی اونچی باتیں کرنے والے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی کتھنی اور کرنی میں بہت فرق ہے۔ کہیں کہیں تو اتنا فرق ہے کہ نا گفتنی ہے۔ مَیں اپنی معلومات اور مطالعے کے بھروسے دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کیفی صاحب کی کتھنی اور کرنی میں ذرا سا بھی فرق نہیں تھا۔ وہ وہی تھے جو نظر آتے تھے۔

لکھنؤ کے سلطان المدارس کے دنوں میں جس سوشلزم سے ملاقات ہوئی تھی، آخر وقت تک اسے سینے سے لگائے رکھا۔ انسانیت کو مذہب مانتے تھے اور عمر بھر انسان دوستی کی مثال بنے رہے۔ ہندو کٹر وادیوں نے مورچے نکالے، مسلم انتہا پسندوں نے فتوے جاری کروائے مگر نہ خود کو بدلا اور نہ اپنی رائے بدلی۔ ان کا دل اور دروازہ کبھی کسی پر بند نہیں ہوا۔ ان کے گھر میں ہر تہوار اس طرح منایا جاتا جیسے وہ تہوار نہ ہو اس عظیم نظریے کا جشن ہو جو سب کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ نیا سال، ہولی، دیوالی اور عید کی دھوم دھام دیکھنے کی ہوتی۔ جب وہ ہولی میں رنگ کھیلتے، دیوالی میں دیے جلاتے یا عید پر سوئیاں بانٹتے تو ان کے چہرے پر ایسی دمکتی ہوئی معصوم خوشی ہوتی کہ دل کو لگتا شاید انقلاب آچکا ہے اور دنیا بدل چکی ہے۔ باہر نہ ہی، جانکی کٹیر کے اندر ہی ہی!

رہن سہن بھی وہی رہا جو تھا۔ سفید کرتا پاجامہ پہنتے تھے۔ مَیں نے اس کے علاوہ اور کچھ پہنے نہیں دیکھا۔ خاص موقع ہوتا تو شیروانی نکل آتی، سردی ہوتی تو شال لپیٹ لیتے اور بس!

اچھے کھانے کے بہت شوقین تھے مگر ان کی نظر میں اچھا کھانا وہ ہوتا تھا جس میں ذائقہ، رنگ، خوشبو اور سلیقہ، ہم وزن ہوں اور خالص دیسی ہو۔

کیفی صاحب نے ساری زندگی بمبئی جیسے شہر میں گزاری مگر ان کے اندر جو ایک گاؤں والا تھا وہ کبھی شہری نہیں بن سکا۔ ضلع اعظم گڑھ کے ایک کونے میں چھوٹا سا گاؤں 'مجواں' جو کسی نقشے پر نظر نہیں آتا، جس تک پہنچنے کے لیے سڑک تک نہیں تھی اور جس کے رہنے والے لال ٹینوں کی روشنی میں شہروں کے چراغاں کے قصے سنا کرتے تھے۔ کبھی ان کے دل سے نہ نکلا۔

وہ لڑکا سید اطہر حسین رضوی عرف اطہر دا۔ جو چودہ برس کی کچی عمر میں لکھنؤ بھیج دیا گیا تھا۔ کبھی جوان نہیں ہوا۔ دھان کے کھیت، آم کے باغ، کچی مٹی کے چولہے اور برسات میں ٹپکتے چھپر ان کے تصور سے کبھی باہر نہیں نکلے۔

میرا بچپن بھی ساتھ لے آیا　　گاؤں سے جب بھی آ گیا کوئی

شوکت آپا کے بنائے ہوئے کھانوں کی خوشبو دور دور تک پھیلی ہوتی تھی۔ مگر ان کی آنکھیں چمکتی ہوئی میزوں پر کچھ اور ہی ڈھونڈتی رہتی تھیں۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ میری بیوی فریدہ کے پاس فون آتا اور کیفی صاحب کی بھاری آواز سنائی دیتی:

''ارے بھائی فریدہ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ باجرے کی روٹی اور لہسن کی چٹنی ایک بار اور کھلا دو!''

لہسن کی چٹنی اور باجرے کی روٹی کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ مجھے یاد ہے وہ بہت بیمار تھے۔ چلنا پھرنا مشکل ہو گیا تھا مگر مجھے دیکھا تو کہا:

''ارے بھئی جاوید، ذرا فریدہ کو یاد دِلانا کہ بہت دن ہو گئے ہیں....''

چونکہ وہ ہمارے گھر آ نہیں سکتے تھے اس لیے ہم لوگ کھانا لے کر جانکی کٹیر پہنچ گئے۔

''کیا کیا لائی ہو؟''

انھوں نے پوچھا اور جب فریدہ نے بتایا کہ روٹی اور چٹنی کے علاوہ دالچہ بھی ہے تو خوش ہو گئے:

''روٹی گرم ہے؟ انھوں نے پوچھا۔''

''جی گرم تو ہے مگر مَیں چولہے پر کچھ سینک لیتی ہوں۔''

جب گرم روٹی، چٹنی اور دالچہ ان کے سامنے رکھا گیا تو دھندلی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ بڑے پیار سے پلیٹ کو دیکھا اور روٹی کا ٹکڑا منھ میں رکھ لیا۔ اسے بہت دیر تک اس طرح چوستے رہے جیسے بچے منھ میں چاکلیٹ پگھلاتے ہیں۔ پھر دھیرے سے رومال ہونٹوں سے لگایا اور روٹی کا ٹکڑا نکال دیا۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے سارے دانت خراب ہو چکے تھے اور باجرے کی

سخت روٹی کو چبانا ان کے بس کا نہیں تھا۔ میں سمجھتا ہوں باجرے کی روٹی اور چٹنی ان کے لیے لذت کا ذریعہ نہیں تھا، وہ ایک رشتہ تھا، ایک کسان اور اس کی زمین کا رشتہ۔ جو کیفی صاحب نے کبھی نہیں توڑا۔

کیفیؔ صاحب کی شاعری کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ کیفیؔ صاحب نے ہمیشہ وہی لکھا جو اپنے آس پاس دیکھا اور جو محسوس کیا۔ ان کے یہاں بناوٹ اور شعری ریاکاری نہیں تھی اس لیے ان پر طرح طرح کے اعتراضات بھی کیے گئے، یہاں تک کہا گیا، کہ وہ شعر نہیں کہتے بلکہ اخباری سرخیوں کو نظم کر دیتے ہیں۔ مگر آج تک کسی نے یہ نہیں بتایا کہ اس میں برائی کیا ہے۔؟ شعر تو ایک جذباتی ردعمل ہے جو اخباری خبر سے بھی ممکن ہے۔ بات آنکھوں دیکھی ہو یا کانوں سنی شاعر اور ادیب کو اس پر اظہارِ خیال کا پورا حق ہے۔ کیونکہ

"وہیں پہنچتی ہے یارو کہیں سے بات چلے"

ویسے کیفیؔ صاحب نے اس الزام کا جواب ایلیا اہرن برگ کے الفاظ میں یوں دیا تھا:

"ایک ادیب کے لیے یہی ضروری نہیں کہ وہ ایسے ادب کی تخلیق کرے جو مستقبل کی صدیوں کے لیے ہو اُسے ایسے ادب کی تخلیق پر بھی قدرت ہونی چاہیے جو صرف ایک لمحے کے لیے ہو اگر اس ایک لمحے میں اس کی قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہو۔" (پیش لفظ: آخرِ شب)

کیفیؔ کی شاعری ہمارے دور کے عام آدمی کی شاعری ہے۔ ان کے خواب محروم آدمی کے خواب ہیں اور ان کا دُکھ غریبوں کی بین الاقوامی برادری کا دُکھ ہے۔

کیفیؔ کے شعر پڑھنے کا تیور چاہے کتنا ہی تیکھا کیوں نہ ہو، ان کی شاعری کا لہجہ مدھم بلکہ کہیں کہیں درد میں ڈوبا ہوا لگتا ہے۔ بالکل اس سوز کی طرح جو شامِ غریباں کے آخر میں پڑھا جاتا ہے۔

وقت نے کیفی اعظمی کو وہ سب کچھ دیا جس کے تصور اور تلاش میں لوگ عمریں گزار دیتے ہیں۔ انھیں عالمی شہرت ملی، بے پناہ مقبولیت ملی، تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ

زندہ رہنے کی بشارت بھی ملی۔کسی کو اپنی زندگی ہی میں اتنا کچھ مل جائے یہ بہت کم ہوتا ہے۔
کیفی صاحب کی اصلی عمر خود ان کو نہیں معلوم تھی۔ ان کی تاریخِ پیدائش ۱۴ر جنوری ۱۹۱۹ء پاسپورٹ بنوانے کے لیے گڑھ لی گئی تھی، لیکن ان کے بچپن کے قصے اور حوالے سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء) کے بعد ہی دنیا میں آئے تھے۔ کیفی کی باقاعدہ شاعری کی عمر تقریباً ساٹھ برس ہے۔ مگر حیرت ہوتی ہے کہ ان ساٹھ برسوں کا کل سرمایہ کوئی ڈیڑھ سو نظمیں، درجن بھر غزلیں، چند طویل نظمیں اور کچھ فلمی گیت ہیں جب کہ اس عرصے میں امیر خسرو نے سات دیوان اور میر تقی میرؔ نے چھ دیوان مرتب کیے تھے۔ جن میں سے ہر ایک میں کئی سو غزلیں تھیں۔ اس حساب سے میں کہہ سکتا ہوں کہ کیفی صاحب نے بہت کم لکھا جب کہ خیال کو شعر میں ڈھالنا ان کے لیے کھیل سے زیادہ نہیں تھا۔ انھیں غور سے پڑھا جائے تو ان کی کم گوئی کی وجہ معلوم ہو جاتی ہے۔ کیفی صاحب نے اپنا قلم اسی وقت اٹھایا ہے جب ان کے دل نے کسی درد کو محسوس کیا ہے۔ درد اپنا ہو یا پرایا احساس کے تار پر مضراب کی طرح لگتا تھا، تب ہی جھنکار ہوتی تھی۔ عین ممکن ہے کہ شاید ایسے ہی کسی خیال کے پیشِ نظر انھوں نے اپنے پہلے مجموعے کا نام ''جھنکار'' رکھا ہو۔ کیفی صاحب کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کئی دور سے گزری ہے۔

جھنکار کی شاعری رومانیت سے حقیقت کی طرف آتے ہوئے شاعر کا کلام ہے۔ جس میں محبوب کی زلفوں کے ساتھ جگہ جگہ لال جھنڈا بھی لہراتا نظر آتا ہے اور پس منظر سے انقلاب زندہ باد کی آواز بھی سنائی دیتی ہے مگر ''آخرِ شب'' اور ''آوارہ سجدے'' تک پہنچتے پہنچتے ایک باوقار ٹھہراؤ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اور یہ تو ہونا ہی تھا۔ گومکھ سے نکلی ہوئی چیختی چنگھاڑتی جھاگ اُڑاتی گنگا پریاگ تک پہنچتے پہنچتے کیسی شانت ہو جاتی ہے۔ یہ شانتی تبھی ملتی ہے جب ہمارے اندر کی چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر نرم ریت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ کیفی صاحب کے سینے کی وہ آگ جو ظلم اور زیادتی کے خلاف ہر انصاف پسند آدمی کے سینے میں ہوتی ہے، کبھی نہیں بجھی مگر اس نے روپ بدل لیا تھا۔ آگ کا ایک روپ روشنی بھی تو ہوتا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہیں لکھا ہے کہ کیفی اعظمی کی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر نہیں بلکہ ان کی آنکھوں میں ہوتی تھی۔ بہت سے لوگ جن میں سے کچھ ان کے ہمعصر بھی ہیں، کبھی اس شریر چمک کو نہیں دیکھ پائے جو ابھرتی تھی اور تارے کی طرح ٹوٹ جایا کرتی تھی۔ ایسے لوگوں کا خیال بلکہ پروپیگنڈا یہی تھا کہ کیفی صاحب نہایت روکھے پھیکے آدمی ہیں، ہنسنا تو دور کی بات ہے کبھی مسکراتے بھی نہیں ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہنسنا بھی خوب جانتے تھے اور ہنسانا بھی۔ شبانہ بہت اچھی mimic ہیں، کوئی آڑا تیڑھا کردار مل جائے تو ایسی نقل اتارتی ہے کہ اصل کا دھوکا ہو جائے کیفی صاحب شبانہ سے یہ نقلیں فرمائش کر کے سنتے تھے اور خوب ہنستے تھے۔ وہ خود بھی کچھ کم نہ تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ مشاعرے سے واپس لوٹتے تو کسی بوگس یا بے وقوف شاعر کی درگت کا نقشہ اس طرح کھینچتے کہ محفل زعفران زار ہو جاتی۔

ان کے one liners غضب کے ہوا کرتے تھے اور جب بھی موقع مل جاتا تھا ایسا وار کرتے تھے کہ ہائے نکل جاتی تھی۔ شوکت آپا نے اپنی کتاب "یاد کی رہگزر" میں لکھا ہے:

> "بمبئی میں ان کے پیٹ کا آپریشن ہوا تھا۔ آپریشن کے بعد جب وہ کمرے میں لائے گئے تو ہانپنے کے انداز میں منہ سے سانس لے رہے تھے اور ڈاکٹر بار بار کہہ رہے تھے: کیفی صاحب ناک سے سانس لیجیے منہ بند رکھیے۔ شبانہ نے جھک کر نیم بے ہوش کیفی کے کان میں کہا: ابا اپنا منہ بند کیجیے۔ کیفی آہستہ سے بولے: منہ میرا انہیں بال ٹھاکرے کا بند کراؤ!"

ان کی زندہ دلی کا ایک اور قصہ مجھے بھی یاد آرہا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کیفی صاحب کو سانس کی بے حد تکلیف تھی۔ ناک اور منہ پر وینٹی لیٹر لگائے رہتے تھے۔ اس دن شام کو جب ان کی نرس چھٹی پر جارہی تھی اور شوکت آپا نرس کو بتارہی تھیں کہ جس نئی نرس کو بھیجو وہ ہوشیار اور تجربہ کار ہونی چاہیے اچانک کمرے کے مدھم سناٹے میں ایک کھرکھراتی ہوئی آواز گونجی:

"گوری بھی ہونی چاہیے۔"

نرس کی تو سمجھ میں نہیں آیا مگر ہم سب دیر تک ہنستے رہے۔

ظ۔ انصاری کو اپنے حافظے اور سخن فہمی پر بڑا غرور تھا۔ کسی بات پر اڑ جاتے تو کہاوت کے ٹٹو کی طرح نہیں ہلتے تھے۔ کیفیؔ بھی کچھ کم نہ تھے بس اتنا فرق تھا کہ ظ۔ انصاری کی طرح اڑتے یا لڑتے نہیں تھے۔ شمع زیدی راوی ہیں کہ ایک دفعہ فارسی کے کسی شعر پر بحث ہو گئی۔ ظ۔ انصاری کا کہنا تھا کہ شعر حافظ کا ہے، کیفیؔ صاحب کا خیال تھا کلام عرفی کا ہے۔ ظ صاحب کہاں ماننے والے تھے، فرمایا:

> ”میں غلطی کر ہی نہیں سکتا، حافظ کو میں نے پڑھا نہیں ہے، ماں کے دودھ کے ساتھ پیا ہے!“

کیفیؔ صاحب عرفی کا دیوان اٹھا لائے اور شعر دکھا کر بڑے پیار سے کہا:

> ”عرفی کو چائے کے ساتھ پی لیا کیجیے۔“

وہ کبھی کسی کی ذاتی زندگی میں دخل نہیں دیتے تھے اور نہ ہی انھیں ایسے لوگ اچھے لگتے تھے جو اپنے مسائل میں انھیں زبردستی شریک کرنے کی کوشش کریں۔ ایشان آریہ مرحوم نے بتایا تھا کہ ایک بزرگ شاعر جن کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اپنی تنہائی اور بے رنگ زندگی کی داستان اتنی تفصیل اور اتنی دیر سے سنا رہے تھے کہ کیفیؔ صاحب سے برداشت نہ ہو سکا کہنے لگے:

> ”تو آپ دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے“

بزرگ شاعر نے ایک ٹھنڈی سانس لی، اور اداس لہجے میں بولے:

> ”کیا عرض کروں کیفیؔ صاحب، بہت کوشش کی مگر کوئی ایسی خاتون نہیں ملی جو پڑھی لکھی بھی ہو، قبول صورت بھی ہو اور جوان بھی نہ ہو۔“

کیفیؔ صاحب نے اپنے لان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا:

> ”تین تو وہ بیٹھی ہیں“

بزرگ شاعر نے اچک کر لان کی طرف دیکھا جہاں شوکت آپا اپنی دو سہیلیوں ذکیہ عادل اور رضیہ سجد یو کے ساتھ پیسہ پوائنٹ رمی کھیل رہی تھیں۔ شوکت آپا پر نظر پڑتے ہی شاعر صاحب

بوکھلا کر بولے:

"ارے کیفی صاحب وہاں تو بھابھی بیٹھی ہیں۔"

کیفی صاحب نے نہایت سنجیدگی سے کہا:

"ارے آپ ہاں تو کہیے، میں ابھی طلاق دے دوں گا۔"

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان بزرگ شاعر پہ کیا گزرگئی ہوگی۔

کیفی صاحب مزاجاً بڑے قناعت پسند تھے۔ قسمت کو مانتے نہیں تھے اور زمانے سے مانگتے نہیں تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو چند کلیوں پر خوش ہو جاتا ہے، جب کہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہوتا ہے۔ ان کی دنیا چار چھ چیزوں پر مشتمل تھی جنھیں ترتیب سے لگایا جائے تو فہرست کچھ یوں بنے گی: سوشلزم، شاعری، شوکت، شبانہ، شراب، شریر بچے اور وہ شامیں جب بامِ مینا سے ماہتاب اترتا ہے اور دستِ ساقی میں آفتاب آتا ہے۔ جو چیزیں انھیں پسند نہیں تھیں ان کی فہرست بھی کچھ لمبی نہیں ہے: انھیں بُرے شعر، بڑبولے شاعر، بدلباس عورتیں اور بگھارے بیگن کبھی پسند نہیں آئے۔

کیفی صاحب کسی ایک میدان کے مرد نہیں تھے۔ ان کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی خدمات کی عمر بھی اتنی ہی لمبی ہے جتنی ان کی شاعری۔ ساٹھ برس کے طویل عرصے پر پھیلی ہوئی یہ خدمات اتنی زیادہ ہیں کہ ان پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی ضرور لکھے گا۔

کیفی صاحب نے اخباری کالم لکھے ہیں، طنز و مزاح لکھا، فلموں کے مکالمے اور گیت لکھے ہیں، بچوں اور بڑوں کے لیے ڈرامے لکھے ہیں، جن میں سے ایک منظوم ڈراما بھی ہے۔ ان کے مشہور ڈرامے "آخری شمع" میں استاد ذوق کا اندھا شاگرد حافظ ویران کہتا ہے:

"استاد! آپ دوسروں کی طرح یک فنے تھوڑے ہی ہیں۔"

کیفی صاحب بھی "یک فنے" نہیں تھے اور ایسا بالکل نہیں تھا کہ ان کے لیے صرف شاعری ہی ذریعۂ عزت ہو۔

مَیں پہلے بتا چکا ہوں کہ اپٹا سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ آج اپٹا کی چھ سو سے زیادہ شاخیں

ہندوستان کے تمام علاقوں اور تمام زبانوں میں کام کر رہی ہیں۔ یہ دنیا کی واحد غیر سرکاری تنظیم ہے جس کے اتنے بہت سے یونٹ ہیں۔ اپٹا کو یہاں تک لانے اور ہندوستانی تھیٹر کو بڑھاوا دینے میں کیفی صاحب کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ڈرامے کا ذکر چھڑا ہے تو ایک بات اور بتا تا چلوں ایک دفعہ میں نے پوچھا:

”کیفی صاحب ہر آدمی اچھے ڈرامے کی بات کرتا ہے مگر اچھا ڈراما کیا ہوتا ہے۔ اسکی تعریف کیا ہے۔؟“

کہنے لگے:

”اچھا ڈراما وہ ہوتا ہے جسے دیکھنے کے بعد یہ دنیا اچھی لگنے لگے۔“

کیفی صاحب نے اپٹا بال منچ بھی بنایا تھا، جس کے ڈراموں میں پہلی بار جھوپڑ پٹی میں رہنے والے بچوں کو بڑے گھروں کے بچوں کے ساتھ شانہ بہ شانہ کھڑا کیا گیا تھا اور سب بچوں کو سمجھایا گیا تھا کہ انسانوں میں کوئی بھید بھاؤ نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ حالات انھیں امیر غریب یا چھوٹا بڑا بناتے ہیں۔ انسان خود کبھی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ کاش سماجی برابری کا یہ سبق آج پھر دہرایا جاسکے۔ کیفی صاحب کا کہنا تھا کہ جن کے ہاتھوں میں مستقبل کو جانا ہے انھیں ان کی ذمہ داری کا احساس کرانا اور ذمہ داری کو نبھانے کے لیے تیار کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ اس لیے انھوں نے اپٹا بال منچ کو چلانے کی ذمہ داری بچوں ہی کو سونپ دی تھی اور منچ کی سکریٹری کے لیے میری بیٹی لبنیٰ کو چنا تھا جو اس وقت صرف بارہ برس کی تھی۔ بچوں کا دل جیتنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ لبنیٰ ہی کا واقعہ لے لیجیے، وہ چھ برس کی تھی جب اپٹا میں آئی۔ اس کا پہلا ناٹک ”ہوری“ تھا۔ جو پریم چند کے ناول گئو دان کی ڈرامائی شکل تھا۔ کیفی صاحب نے ڈراما دیکھ کر لبنیٰ کی بہت تعریف کی اور جب لبنیٰ نے کہا: "Thank you uncle" تو کیفی صاحب نے اسے پاس بلایا، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دھیرے سے کان میں کہا :

”انکل نہیں! ابا کہا کرو۔“ نہ جانے کتنے بچے تھے جو انھیں ابا کہا کرتے تھے اور کیفی صاحب بھی انھیں اولاد کی طرح پیار کرتے تھے بلکہ ان کے ساتھ بچہ ہی بن جایا کرتے

تھے۔

یہ ۱۹۷۳ء کی بات ہے۔ ۱۰ فروری کو میری شادی کی سال گرہ تھی اور پروگرام یہ بنا تھا کہ گھر ہی میں کچھ عزیزوں دوستوں کو جمع کرکے جشن برپا کیا جائے گا تیاری چل رہی تھی کہ اچانک خبر ملی کہ ''کیفی صاحب اسپتال میں ہیں ان کے دماغ کی نس پھٹ گئی ہے!'' میں وارڈن روڈ پر برج کنڈی اسپتال پہنچا تو کمپاؤنڈ میں بہت سے شناسا چہرے دکھائی دیے سب اداس، سب خاموش۔ کیفی صاحب ICU میں تھے۔ کسی کو ملنے تو کیا دیکھنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ سب لوگ اس دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں سے کوئی خبر ملنے کے آثار تھے۔ سردار جعفری باہر آئے تو لوگوں نے گھیر لیا۔

''ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا....''

انھوں نے کہا اور پھر اندر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد مجھے سلطانہ آپا دکھائی دیں۔ وہ ریسیپشن پر کھڑی تھیں۔ ان کے ہونٹ سفید اور سوکھے ہوئے تھے اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ میرے سوال سے پہلے ہی انھوں نے جواب دے دیا۔

''فالج کا اثر ہے، ۴۸ گھنٹے بہت بھاری ہیں....''

ایسے موقعوں پر ذہن ایک ڈرے ہوئے بچے کی طرح ہو جاتا ہے جس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ روئے، چلائے یا کسی کو مدد کے لیے آواز دے.... شاید وہاں موجود سب لوگوں کی یہی کیفیت تھی، سبھی ڈرے سہمے خاموش کھڑے تھے۔

اندھیرا ہونے لگا تو میں واپس جانے لگا۔ اسپتال کے گیٹ کے پاس مجھے وہ بوڑھا دکھائی دیا جو مدن پورا بڑی مسجد کے فٹ پاتھ پر پلاسٹک کے برتن بیچتا تھا اور میں آتے جاتے اکثر اسے دیکھا کرتا تھا میلا کرتا، پھٹی لنگی اور سر پر لپٹا ہوا انگوچھا، وہ اس فائیو اسٹار اسپتال میں بہت ہی اجنبی لگ رہا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو چاچا؟''

میں نے پوچھا اس نے مجھے پہچاننے کی کوشش کی اور بولا:

"ارے آپ کو نہیں معلوم کا؟.... ہمرے کیپھی صاب ہیں یاں.... او
کی طبیتیا ناساج ہوئی گئی ہے؟"

یہ تھا کیفی صاحب کا جادو، جو سردار جعفری سے لے کر مدن پورا کے ہا کر تک کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔

کیفی صاحب بچ تو گئے مگر جسم کا پورا بایاں حصہ مفلوج ہو گیا۔ بایاں ہاتھ ٹوٹی ہوئی لکڑی کی طرح ان کی گود میں پڑا رہتا تھا اور جس وقت وہ اس بے جان ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ سے اٹھا کر ادھر سے ادھر رکھتے تو آنکھیں بند کر لینے کو جی چاہتا۔ بایاں پاؤں تھوڑا بہت حرکت کرنے لگا تھا اور لنگڑا کے چلنے بھی لگے تھے مگر وہ ایسی ادھوری اور محتاج زندگی نہیں جینا چاہتے تھے۔

سلام کرنا چاہیے شوکت آپا کو جنھوں نے سچ مچ اردھانگنی بن کر دکھایا ہے۔ وہ کب کیفی کے بے جان ہاتھ پاؤں میں ڈھل گئیں کہ کسی کو احساس بھی نہیں ہوا اور اس وقت تک سیوا کرتی رہیں جب تک کیفی صاحب کے اندر بجھتی ہوئی شمع نے پھر سے اپنی لَو نہ پکڑ لی۔ کیفی صاحب نے اپنے آدھے دھڑ کے ساتھ جو کارنامے انجام دیے وہ ایک مثال ہیں۔ سردار جعفریؔ نے کہا تھا۔

"کیفیؔ نے فالج کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ ایسا ہے کہ اب یہ بیماری کسی
شاعر یا ادیب کے پاس تک نہیں پھٹکے گی!"

میں خود ان کی بے پناہ قوتِ ارادی کا گواہ ہوں۔ انھوں نے نہ کبھی خود شکست مانی اور نہ ہی کسی دوسرے کو ماننے دی۔ جب میری آنکھوں میں کالا موتیا اترا اور ڈاکٹر نے کہا کہ اس کا کوئی علاج نہیں ہے تو ایسا لگا جیسے ساری روشنیاں ایک ایک کر کے بجھ گئی ہوں۔ بہت دھندلا دکھائی دینے لگا تو سوچا کہ شاید وہ وقت آچکا ہے جب قلم اٹھا کر رکھ دیا جاتا ہے اور کتاب بند کر دی جاتی ہے۔ یہ ایک بھیانک تصور تھا۔ ساری زندگی جن کے ساتھ بسر کی ان کا ساتھ چھوٹ جائے گا۔ یہ سوچ کر انگلیاں ٹھنڈی ہو کر کانپنے لگتیں مگر کوئی راستہ بھی نہیں تھا اس لیے دھیرے دھیرے خود کو سمیٹنا شروع کیا۔ بچپن کی پرانی عادت تھی کہ سونے سے پہلے کوئی کتاب ضرور پڑھا

کرتا تھا، وہ چھوٹ گئی مضامین اور ڈرامے لکھنا بند، فلمیں دیکھنا بند، اور فلمیں لکھنا بھی تقریباً بند۔ کسی ویران جزیرے پر پھنسا ہوا مسافر اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے سمندر کو جس طرح دیکھتا اور مایوس ہوتا ہے۔ میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔

کیفی صاحب کو خبر ملی۔ ان کے نوکر گوپال کا فون آیا صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ میں پہونچا تو انھوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر دیر تک میری آنکھوں میں اس طرح دیکھتے رہے جیسے کچھ ڈھونڈ رہے ہوں پھر گلا صاف کر کے بولے:

"تیس سال سے اپنے آدھے مردہ دھڑ کو لیے ہوئے ساری دنیا میں گھوم رہا ہوں اور وہ تمام کام کر رہا ہوں جو ایک ثابت و سالم انسان کرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے فالج سے ہار نہیں مانی اور نہ مانوں گا۔ تمہیں میں نے یہ کہنے کے لیے بلایا ہے کہ ہار نامت اور اس وقت تک لڑتے رہنا جب تک آنکھوں میں ذرا سا بھی دم اور ہاتھوں میں جنبش باقی رہے اب دوبارہ مجھے خبر نہیں ملنی چاہیے کہ جاوید صدیقی نے سنیاس لے لیا ہے اور کمرہ بند کر کے بیٹھ گئے ہیں اب یہ بتاؤ کیا پیو گے۔ میں تو وسکی پینے والا ہوں۔"

میں دیر تک اپنی دھندلی آنکھوں سے اس آدمی کو دیکھتا رہا جس کا آدھا دھڑ مردہ تھا مگر وہ ادھورا نہیں تھا میں گھر واپس آیا اور وہ کتابیں اٹھائیں جو پھینک دی تھیں اور ایک محدب شیشے کی مدد سے پڑھنا شروع کر دیا دوسرے دن بہت سارے اسکیچ پن لے آیا اور کاغذ پر موٹے موٹے حروف بننا شروع ہو گئے۔ میں نے بھی ہار ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ آج میں تقریباً اتنا ہی مصروف ہوں جتنا پہلے ہوا کرتا تھا اور اکثر سوچتا ہوں کہ اگر کیفی صاحب وہ چار جملے نہ بولتے تو ویران جزیرے پہ کھڑا ہوا آدمی مایوسی کے تاریک سمندر میں کب کا ڈوب چکا ہوتا۔

کیفی صاحب سچ مچ ایک بہادر اور نڈر آدمی تھے۔ انھوں نے فالج جیسے مرض کا مقابلہ کیا سو تو کیا مگر عام حالات میں بھی ان کی بے باکی اور بے جگری کے بہت سارے قصے میں نے

سنے ہیں۔ کیفی صاحب پر میں نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا" کیفی کی زندگی کے سات منظر"۔ میں یہاں اس مضمون کا ایک اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے کیفی کی جی داری کا اندازہ ہوتا ہے۔

مہیش بھٹ نے اپنے فلیٹ کی کھڑکی کھولی اور باہر جھانکا شام ہو رہی تھی اور سڑکیں ویران پڑی تھیں۔ چاروں طرف ایک عجیب خاموشی تھی جسے .T.V پر سنائی جانے والی خبروں کی آواز اور سمندر کا شور توڑنے کی مسلسل کوشش کر رہے تھے۔ بمبئی میں فسادات کی دوسری فصل کاٹی جارہی تھی۔ مہیش بھٹ نے اپنے مسلمان دوستوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ پتہ نہیں کون کہاں ہوگا اور کس حال میں ہوگا۔ اچانک اسے یاد آیا کیفی صاحب تو پاس ہی رہتے ہیں۔ اور آج کل وہ بالکل اکیلے ہیں۔ مہیش سے رہا نہ گیا۔ کیفی صاحب کی خیریت معلوم کرنا بہت ضروری ہے۔ مہیش نے کیفی صاحب کے گھر میں جھانکا تو دیکھا کہ وہ اپنے لان پر اکیلے بیٹھے ہیں اور سامنے چائے کی ٹرے رکھی ہے۔ مہیش کو دیکھ کر کیفی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ایک مسکراہٹ جو کافی تھکی ہوئی تھی ان کے ہونٹوں پر آئی:

"آؤ مہیش آؤ۔ تم کیسے آگئے۔"

"کیفی صاحب"

مہیش نے اپنے بغیر بالوں والے سر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"حالات تو روز بہ روز زیادہ خراب ہوئے جارہے ہیں۔ سنا ہے فسادیوں کے پاس ووٹر لسٹ ہے اور وہ چن چن کر نشانہ بنا رہے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے تو دروازوں سے اپنی Name Plate تک نکال دی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو کسی محفوظ جگہ...."

مہیش سے آگے نہیں بولا گیا۔ کیفی صاحب چپ چاپ چائے کے پیالے میں سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھتے رہے اور مہیش نے کیفی صاحب کے گھر کا جائزہ لیا۔ نیچی باونڈری جسے کوئی بھی پھلانگ سکتا ہے، لکڑی کی دیواریں، پھونس کی چھت، جس کے لیے ایک چھوٹی سی چنگاری ہی

کافی ہو گی۔ مہیش بھٹ نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا:

"کیفی صاحب آپ یہاں سے ہٹ جائیں تو اچھا ہے۔"

کیفی صاحب نے مہیش بھٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور دیر تک دیکھتے رہے پھر ایک ایسی آواز میں جس میں کوئی کمزوری کوئی لرزش نہیں تھی بولے۔

"یہ گھر میرا ہے، یہ شہر میرا ہے، یہ ملک میرا ہے، یہاں سے مجھے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔"

مہیش بھٹ نے سر جھکا لیا اور دل میں سوچا۔ اس یقین کے آگے کوئی بھی نفرت زندہ نہیں رہ سکتی اور میرا خیال ہے کہ یہ یقین ہی کیفی کی زندگی تھا۔ وہ جب تک رہے اپنے وطن کو اپنی جان سمجھتے رہے۔

ایک دن All India IPTA کے جنرل سکریٹری عابد رضوی مرحوم کہنے لگے:

"بھائی جاوید صاحب اپٹا کے آسمان پر جتنے ستارے تھے سب ایک ایک کر کے ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ کچھ لوگ بچ گئے ہیں جو آج اپٹا کی پہچان ہیں۔ ان پر ڈاکیومنٹری فلمیں بنائی جانی چاہیے۔"

آئیڈیا بہت اچھا تھا مگر خرچ کا حساب کیا تو اندازہ ہوا کہ آل انڈیا اپٹا کے خزانے میں جتنا مال ہے اس میں صرف ایک ڈاکیومینٹری بن سکتی ہے۔ چناں چہ ارادوں کو مختصر کیا گیا اور طے پایا کہ میں اپٹا کے بزرگوں کے انٹرویو ریکارڈ کروں، پہلا انٹرویو کیفی صاحب کا تھا۔

میں جانکی کٹیر پہنچا اور شوٹنگ کی تیاری شروع کر دی۔ جب تک میں نے کیمرہ لگایا گوپال کیفی صاحب کو لے کر آ گیا۔ وہ سامنے بیٹھے اور دیر تک اپنی سانس درست کرتے رہے۔ انھوں نے وہ پسینہ صاف کیا جو کرسی تک پہنچنے کی کوشش میں ان کے اوپری ہونٹ پر آ گیا تھا۔ ان کی انگلیوں میں پھنسا ہوا سفید رومال کانپ رہا تھا۔ وہ بکھرے، الجھے بال جن کی ہر جنبش دھڑکنیں بڑھا دیا کرتی تھیں سفید اور روکھے ہو چکے تھے۔ موٹی موٹی غلافی آنکھیں چھوٹی اور بے رونق ہو گئی تھیں۔ وہ ہونٹ جن سے نکلا ہوا ہر لفظ موتی بن جایا کرتا تھا کسی خالی سیپی کی طرح کھلے

ہوئے تھے۔

انھوں نے گلہ صاف کیا، ایک لمبی سانس لی اور کھرکھراتی ہوئی مگر اونچی آواز میں بولنا شروع کیا:

”سن لیجیے۔ میرا One Point ایجنڈا ہے۔ مَیں غلام ہندوستان میں پیدا ہوا، آزاد ہندوستان میں زندگی گزاری اور سوشلسٹ ہندوستان میں مرنا چاہتا ہوں....“

سوشلسٹ ہندوستان کا تصور! ایک خوب صورت خواب تھا جو کیفی صاحب کے ساتھ اور بھی لاکھوں آنکھوں نے دیکھا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر آنکھیں بند ہو چکی ہیں۔ خواب ابھی تک خواب ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کیفی صاحب اب بھی کہیں، کسی دنیا میں امید کی جھلملاتی شمع کو دونوں ہاتھوں سے حلقہ کیے بیٹھے ہوں گے:

آج تم کچھ نہ کہو
آج میں کچھ نہ کہوں
بس یونہی بیٹھے رہو
ہاتھ میں ہاتھ لیے
غم کی سوغات لیے
گرمیِ جذبات لیے
کون جانے کہ اسی لمحے میں
دور پربت پہ کہیں برف پگھلنے ہی لگے....!

☆☆☆

وہ ڈیڑھ دن

اردو ادب میں تنقید کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور نقاد کو ایک ایسا پہنچا ہوا فقیر سمجھا جاتا ہے۔ جو صورت دیکھتے ہی دلوں میں چھپے ہوئے سارے راز جان لیتا ہے اور پھر جب انھیں بیان کرتا ہے تو آنکھیں بند کر کے جھومنے کو جی چاہتا ہے۔ مَیں نے تو ایسے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو تنقید پڑھ کے جھومتے ہی نہیں وجد میں آجاتے ہیں۔

اپنی اپنی وسعتِ فکر و نظر کی بات ہے۔ مجھے تنقیدی مضامین پڑھنا کبھی اچھا نہیں لگا۔ پڑھو تو ایسا لگتا ہے جیسے Botany کا پروفیسر کسی خوبصورت اور نازک پھول کو پنکھڑی پنکھڑی توڑ رہا ہو اور بتاتا جا رہا ہو کہ دیکھو یہ Stigma ہے اور یہ Filamenet ہے۔ ذرا سوچیے کہ عبدالرحمٰن بجنوری صاحب غالبؔ کی شوخیِ تحریر کو کھینچ کر ایران لے جائیں اور بتائیں کہ فریادی نے کاغذی پیرہن کیوں پہنا تھا اور علامہ نظم طباطبائی لکھنوی فرمائیں کہ شعر ادراک و فہم سے بالاتر ہے یعنی بے معنی ہے۔ لیجیے ایک نہایت لطیف شعری اَثر تشریح و تنقید کی نذر ہو گیا۔ وہ تو اللہ بھلا کرے وارث علوی صاحب کا جن کی پھلجھڑیاں چھوڑتی نثر، ہلکی ہلکی چٹکیاں اور شریر جملے پڑھتے ہوئے کبھی یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ مَیں ایک سنجیدہ اور عالمانہ بحث میں پھنسا ہوا ہوں جسے تنقید کہتے ہیں۔

وارث صاحب نے بہت لکھا ہے اور خوب لکھا ہے، مگر اُن کا فن، اُن کی نظر کی گہرائی اور صحیح تجزیہ کرنے کی انوکھی قوت اپنی پوری تابانی کے ساتھ اُن تحریروں میں نظر آتی ہے جو منٹو اور

بیدی کے بارے میں ہیں۔ مَیں بیدی صاحب کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ اکثر ان سے ملتا بھی تھا۔ وہ کبھی موڈ میں ہوتے تو اپنی کوئی کہانی بھی سنا دیتے ورنہ اپنے بے شمار لطیفوں سے شرابور کر کے واپس بھیج دیتے، مگر مَیں راجندر سنگھ بیدی کو جانتا تھا پہچانتا نہیں تھا۔ پہچان تو اس وقت ہوئی جب بیدی پر وارث صاحب کی کتاب "بیدی ایک مطالعہ پڑھی"۔ وارث صاحب کی کتاب نے وہی کام کیا جو 3D چشمہ کرتا ہے۔ تیسرا Dimenssion چشمہ لگا کر ہی دکھائی دیتا ہے اور وارث صاحب کی تحریر میرے لیے 3D چشمہ تھی۔

وارث صاحب کی ایک خصوصیت اور بھی ہے جو انھیں دوسرے نقادوں سے ممتاز کرتی ہے، وہ ہے ان کی انفرادیت ـــــ وہ کسی ادبی گروپ میں شامل نہیں ہیں اور نہ ہی کسی نظریاتی مسلک کو مانتے ہیں۔ نہ حبِّ علی نہ بغضِ معاویہ۔

'آپ اپنی منزل ہوں اپنی راہ چلتا ہوں'۔

اس لیے جب الیاس شوقی نے پوچھا:

"جاوید صاحب، احمد آباد چلتے ہیں وارث علوی سے ملنے؟"

تو مَیں بالکل اسی طرح اُچھل کر تیار ہوا جیسے کوئی قوال اجمیر شریف جانے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ ۲۹؍اپریل ۲۰۱۲ء کی صبح ۶؍بجے چار آدمیوں کا قافلہ احمد آباد جانے کے لیے تیار ہوا۔ اس میں قافلہ سالار الیاس شوقی کے علاوہ مَیں، اسلم پرویز اور سنیتا مال پانی شامل تھے۔ سنیتا ڈاکومینٹری فلمیں بناتی ہیں اور وارث علوی کی ملاقات کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لینا چاہتی تھیں۔

بمبئی سے احمد آباد گھنٹے بھر کا سفر ہے۔ مَیں سارے راستے وارث صاحب کے بارے میں سوچتا رہا۔ مَیں نے انھیں پڑھا بھی تھا، سنا بھی تھا (منٹو کے اوپر ویڈیو انٹرویو) اور اُن پر لکھے گئے باقر مہدی کے وہ خاکے بھی نظر سے گزرے تھے جن میں باقر مہدی زیادہ اور وارث علوی بہت کم تھے، مگر خیر یہ تو باقر صاحب کی کمزوری تھی۔ انھیں اپنے علاوہ ہر شخص بونا دکھائی دیتا تھا۔ باقر صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ وارث صاحب ایک بہت بڑی پرانی حویلی میں رہتے ہیں جس کے صحن میں پھولوں سے بھری کیاریاں ہیں اور یہ کہ اُن کے پاس نایاب کتابوں

کا انمول خزانہ ہے۔

مجھے وارث صاحب سے ملنے کی جتنی بے تابی تھی اتنا ہی شوق پرانی حویلی، پھول اور نایاب کتابیں دیکھنے کا تھا۔ ان تینوں چیزوں سے میرے بچپن کا گہرا رشتہ رہا ہے۔ کہیں اور بھی ایک حویلی تھی جس کی کیاریاں گلابوں سے اور دیواریں جوہی سے مہکا کرتی تھیں اور بے نور کمروں میں سیکڑوں اداس کتابیں کانچ کی الماریوں میں سے جھانکتی رہتی تھیں۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ وارث صاحب کے گھر میں میرے ماضی کا ایک ٹکڑا مجھے خوش آمدید کہنے والا ہے۔

وارث صاحب نے ایک ہوٹل میں ہمارے لیے کمرے بک کرادیے تھے جہاں ہم چاروں کے نام پتے تو لکھے ہی گئے، رجسٹر پر انگوٹھے بھی لگوائے گئے کہ ہم میں سے کسی کا کریمنل ریکارڈ ہو تو فوراً پکڑا جائے۔ ہم نے سامان کمروں میں پھینکا، ایک ایک مسالے والی گجراتی چائے پی اور بھاگے لال دروازے کی طرف جہاں وارث صاحب کی قیام گاہ تھی۔ آٹو رکشا والے نے ایک گلی کے سامنے اتار دیا جو اتنی پتلی تھی کہ اس میں سائیکل کے علاوہ کوئی اور سواری جا ہی نہیں سکتی تھی۔ ہم لوگ دورویہ چھوٹے چھوٹے مکانوں کے درمیان سے گزرتے اور کھیلتے ہوئے بچوں کو پھلانگتے ایک کھلی جگہ پہنچے جہاں ایک بڑی سی محراب باہیں کھولے کھڑی تھی۔ مَیں خوش ہوگیا:

"یہ ہوئی نا بات ___ وارث علوی کی حویلی کا دروازہ ایسا ہی ہونا چاہیے ___!"

معلوم ہوا کہ وہ دروازہ تو ہے مگر ایک اور گلی کا ___ جو پچھلی گلی سے بڑی بھی تھی اور صاف ستھری بھی۔ شوقی صاحب جو آگے آگے لپک رہے تھے اچانک لکڑی کے ایک پرانے دروازے کے سامنے رُک گئے جس کے باہر لوہے کا Half Gate کھلا ہوا تھا اور ایک نئی موٹر بائیک کھڑی ہوئی تھی۔ شوقی صاحب لکڑی کے دروازے میں گھنٹی کا بٹن ڈھونڈ رہے تھے کہ دروازہ کھل گیا اور روشن آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں والے نوجوان نے گرم جوشی کے ساتھ کہا:

"آئیے ___ آئیے، نانا آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں!"

اندر گھستے ہی پام کے ایک بڑے سے پیڑ نے استقبال کیا، مگر اس پام کے آس پاس نہ کوئی کیاری تھی نہ پھول بلکہ صحن بھی نہیں تھا۔ جس کا تذکرہ باقر مہدی نے کیا تھا۔ ہم تین سیڑھیاں

چڑھ کے ایک بڑے سے ہال میں داخل ہوئے جس میں کانچ کی الماریاں اور کتابیں تو دِکھائی دیں مگر معاملہ کچھ بے ترتیب سا لگا۔ جس چیز کو جہاں ہونا چاہیے تھا وہ وہاں نہیں تھی۔ اس خوبصورت نوجوان نے جس کا نام اویس تھا بتایا کہ پرانے گھر کے ایک حصے میں نئی عمارت تعمیر کی جارہی ہے جس کی وجہ سے سارا گھر اُلٹ پلٹ ہوگیا ہے۔ مَیں نے پرانی حویلی کا حوالہ دیتے ہوئے پوچھا:

"کیا وارث صاحب اب فلیٹ میں رہیں گے؟"

اویس ہنسا۔

"نہیں ہم رہیں گے۔ اب ہم بڑے ہو گئے ہیں نا، اس لیے پرانا گھر چھوٹا پڑتا ہے ___!"

ہم لوگ بیٹھنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ وارث صاحب کی آواز سنائی دی:

"آئیے ___ آئیے، یہاں تک پہنچنے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

وہ اندر کے کمرے سے باہر آرہے تھے۔ وہ اتنے ہی بھاری بھرکم تھے جتنی ان کی ادبی شخصیت تھی۔ململ کا ڈھیلا ڈھالا آدھی آستین والا گجراتی کرتا۔ بڑے پائنچوں کا پاجامہ۔ کمر کی تکلیف کی وجہ سے کچھ جھکے ہوئے، چہرہ کھلا ہوا۔ آنکھیں چمکتی ہوئی اور ہونٹوں پر ایک بے حد شفیق مسکراہٹ۔ ان کی مسکراہٹ کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس میں کوئی ملاوٹ نہیں تھی۔ ایسی مسکراہٹیں شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں آنکھیں دل کی بات کہتی ہیں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ مسکراہٹ بھی کبھی جھوٹ نہیں بولتی ___! وہ باری باری سب سے بڑے تپاک سے ملے۔ مجھ سے کہنے لگے:

"ارے، آپ کا انتظار تو سارا احمد آباد کر رہا ہے!"

بعد میں پتہ چلا کہ یہ اشارہ ان کے نواسے نواسیوں کی طرف تھا جو مجھ سے ملنے اور میری فلموں کے بارے میں باتیں کرنا چاہتے تھے۔

وارث صاحب ایک آرام کرسی پر اور ہم سب انھیں گھیر کر بیٹھ گئے۔ سنا تھا کہ وہ جتنا اچھا

لکھتے ہیں اتنا ہی اچھا بولتے بھی ہیں اور یہی ہوا۔ چائے کب آئی، کھانا کب کھایا، دن کس وقت ڈوبا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ 'یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا'۔ ان کی باتوں میں بہت سی باتیں تھیں۔

یقین تھا اور معلومات کا ایک موجیں مارتا سمندر تھا۔ شوقی، اسلم اور مَیں ان سے سوال پر سوال کر رہے تھے اور وہ چومکھی لڑ رہے تھے۔ اب تو یاد بھی نہیں کہ ہم نے کتنی باتیں کی تھیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ ایک پورا دن اور دوسرا آدھا دن ہم نے وارث صاحب کو نچوڑنے میں لگایا تھا اور بہت کچھ سیکھنے اور جاننے کو ملا تھا۔ موضوعِ بحث کوئی بھی ہو، ان کی اپنی ایک رائے تھی، دلیل تھی اور حوالے تھے۔ اختلاف اور اتفاق تو ضمنی باتیں ہیں۔

سلمان رشدی سے تسلیمہ نسرین تک، عبادت بریلوی سے سلیم احمد تک اور امراؤ جان سے احمد آبادی بریانی تک ـــــ باتیں ہی باتیں۔ کچھ باتوں کے نشان تو اَمٹ ہیں.... اسلم پرویز نے کہا:

"آپ نے آل احمد سرور کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جس زبان میں تنقید لکھتے ہیں وہ تنقید کی زبان نہیں ہے ـــــ!"

شوقی نے کہا:

"تنقید ایک سنجیدہ بحث ہے، جب کہ آپ کے یہاں اکثر جملے بازی ہو جاتی ہے۔"

مَیں نے پوچھا:

"تنقید کی زبان کیا ہے؟ کیا آپ کی زبان تنقید کی زبان ہے؟"

وارث صاحب ہنسے:

"نہیں بھئی ـــــ مَیں جو زبان لکھ رہا ہوں وہ تو میری ہے ـــــ تنقید کی زبان شگفتہ ہونی چاہیے مگر موضوع بھی زبان کو طے کرتا ہے۔ "اوراقِ پارینہ" میں میرے سب مضامین بے حد سنجیدہ ہیں۔ بیدی پر پوری ایک کتاب ہے جس میں کوئی فقرے بازی نہیں ہے ـــــ

تمام چیزیں میرے یہاں ملتی ہیں۔ جہاں سنجیدہ زبان کی ضرورت ہے وہاں پوری سنجیدگی کے ساتھ لکھتا ہوں، لیکن جہاں ہنسنے کا موقع ہوتا ہے وہاں ہنسوں کیوں نہیں؟ کیا پابندی ہے؟

شوقی نے پوچھا:

''وارث صاحب آپ نے ہمیشہ افسانہ نگاروں پر لکھا ہے۔ شاعری پر بھی تو آپ کی اچھی نظر ہے۔ اس پر کیوں نہیں لکھا؟''

وارث صاحب نے سر ہلایا:

''شاعری مَیں نے پڑھی بہت ہے۔ اردو کی بھی اور فارسی کی بھی اور انگریزی کی بھی، اور شاعری پر لکھا بھی ہے مگر غزل کی جو شاعری ہے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی، کیوں کہ وہ میرا فیلڈ نہیں ہے۔ جس طرح کے اچھے مضامین غزل پر لکھے جاتے تھے اُن مضامین میں خیال کم ہوتا تھا، احساس زیادہ ہوتا تھا۔ خیال کو تو آپ اُٹھا سکتے ہیں، احساس کو کیسے اُٹھائیں گے؟''

مَیں نے چائے پیتے پیتے سوال کیا:

''وارث صاحب! جب آپ تنقید کے لیے موضوع کو چنتے ہیں تو کیا سوچ کے انتخاب کرتے ہیں؟''

وارث صاحب نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا:

''اگر سوچ کے چُنتا ہوتا تو ایسے خراب موضوعات پر تھوڑی لکھتا۔۔۔!''

ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ موضوع اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وارث صاحب ادیبوں کی گروپ بندی کو ادب کے لیے بے حد نقصان دہ مانتے ہیں۔ مَیں نے پوچھا:

''کیا آپ کو لگتا ہے کہ آپ بھی ادبی سیاست کا شکار ہو رہے ہیں؟''

وہ ہنسے، اس ہنسی میں دُکھ تھا۔

''ہو گئے ہیں ـــــ ہو رہے ہیں نہیں! یہ تو میری ہمت ہے بلکہ ہمت کی

بات بھی نہیں ہے، یہ میرا کردار ہے اور مجھے اپنی تحریروں پر بھروسا ہے۔
مَیں جو کچھ لکھتا ہوں اس میں انفرادیت ہے۔ میرا جو اسلوب ہے وہ
دوسرے تمام لکھنے والوں سے مختلف ہے اور خوبصورت ہے اور مجھے اسی
بات کا بھروسا رہا اور میں لکھتا چلا گیا۔ کسی کی بھی پرواہ کیے بغیر....''

اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے کہ وارث صاحب نے اپنے لیے جو جگہ بنائی ہے وہ
اُن کی اپنی بنائی ہوئی ہے۔ آگے بڑھنے کے لیے انھوں نے کبھی کسی گروپ یا نظریے کا سہارا
نہیں لیا۔ سہارے کی بات نکلی ہے تو میں عرض کروں کہ اُن کی کمر کی ہڈی میں تکلیف رہتی ہے مگر
پھر بھی سہارا نہیں لیتے، نہ کسی کندھے کا نہ کسی ڈنڈے کا۔ کہنے لگے:

''اب صحت ساتھ نہیں دیتی بھائی! گھٹنوں سے نہیں چلا جاتا، پھر بھی گھر کے
باہر جو گلی ہے اس میں چکر لگاتا ہوں تاکہ پاؤں چلتے رہیں۔ پڑھنا لکھنا
بھی کم ہوگیا ہے کیوں کہ آنکھوں میں موتیابند اتر آیا ہے۔ ویسے اردو ادب
کی حالت یہ ہے کہ آپ سال بھر تک کچھ بھی نہ پڑھیں تو بھی کچھ فرق نہیں
پڑتا۔ لکھنے کو بہت دل چاہتا ہے اور دو مضمون لکھنا بہت ضروری ہیں کہ
مَیں وعدہ کر چکا ہوں۔ ایک سلام بن رزاق پر دوسرا امنشا یاد پر....''

شوقی نے فوراً یاد دلایا:

''آپ کو ساجد رشید پر بھی لکھنا ہے۔''

وارث صاحب کچھ اُداس ہو گئے۔ سر جھکا کر منٹو کے خطوط کی کتاب کو اُلٹتے پلٹتے رہے۔ جو
اسلم پرویز نے اُن کے نام معنون کی تھی۔ پھر ایک اُداس مسکراہٹ کے ساتھ بولے:

''ساجد سے تو یہ وعدہ ہی نہیں تھا کہ تم مر جاؤ گے اور ہمیں مضمون لکھنا
پڑے گا۔ ہم نے تو کہا تھا جب جی میں آئے گا تب لکھیں گے۔ ابھی تو تم
لکھتے رہو اور اتنا لکھو کہ ہم تمھارے اوپر لکھنے کے قابل بن جائیں۔ وہ
اپنے دل میں اتنے بہت سے Blocks لے کر کیوں آیا تھا۔''

اسلم پرویز نے یاد دلایا:

"ایک اور افسانہ نگار آپ سے چھوٹ گیا ہے ___ احمد ندیم قاسمی ___!"

قاسمی کا نام سن کر وارث صاحب کے چہرے پر چمک آگئی اور آواز کچھ اونچی کر کے بولے:

"احمد ندیم قاسمی کے چھوٹنے کی وجہ ہے اور بہت بڑی وجہ ہے ___ وہ میرا سب سے زیادہ پسندیدہ افسانہ نگار تھا ___ ارے شروع میں تو سب اسی سے آغاز کرتے تھے۔ قرۃ العین حیدر بھی۔ سب دیوانے تھے اس کے۔ نہیں لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی کتابیں نہیں ہیں میرے پاس ___ اس کی ساری کتابیں زبیر رضوی کے پاس تھیں مگر اس نے مجھے نہیں دیں، فضیل جعفری کو بھجوادیں۔ اسلم نے وعدہ کیا کہ وہ احمد ندیم قاسمی کی ساری کتابیں جو دوبارہ شائع ہو چکی ہیں، وارث صاحب کو بھجوادیں گے اور وارث صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ مضمون لکھیں گے۔

بات میری فلموں اور ڈراموں کی چل نکلی تو مَیں نے وارث صاحب سے پوچھا:

"آپ نے بھی بہت سے ڈرامے لکھے ہیں!"

کہنے لگے:

"ہاں! بہت سے لکھے ہیں۔ مگر سب Comedies ہیں۔"

"کامیڈی ہی کیوں؟"

مَیں نے پوچھا۔ ہنسے اور فرمایا:

"ارے مَیں نے تنقید کو کامیڈی بنادیا تو ڈرامے کو ٹریجڈی کیسے بناتا؟"

کچھ دیر تک اپنے ڈراموں کا ذکر کرتے رہے، پھر کہا:

"مگر میرے سارے ڈرامے گجراتی میں ہیں۔ میرے ایک دوست نے کہا تھا کہ آپ عجیب آدمی ہیں۔ اپنی مادری زبان میں تو تنقید لکھتے

ہیں اور تخلیقی کام دوسری زبان میں کرتے ہیں!"

مَیں نے موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور فوراً پوچھا:

"آپ کا مطلب ہے کہ تنقید تخلیقی کام نہیں ہے ـــــ؟"

وارث صاحب زور سے ہنسے، پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھیرے سے بولے:

"میرے لیے تو سب سے بڑی تخلیق اچھی تنقید ہی ہے ـــــ!"

دوسرے دن سہ پہر میں جب ہم لوگ اُن کے گھر سے نکل رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ مَیں ناحق باقر مہدی کی بتائی ہوئی حویلی، کتابیں اور پھول ڈھونڈ رہا تھا۔ یہ سب تو وارث علوی کی شخصیت بن چکے ہیں۔ ان میں وہی وقار ہے جو پُرانی حویلیوں میں ہوتا ہے، وہی حیران کُن دلکشی ہے جو نایاب کتابوں میں ملتی ہے اور خوشبو ہے جو باہر سے نہیں اندر سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ خلوص اور سچائی کی خوشبو ـــــ! (مئی ۲۰۱۳ء)

☆☆☆

ساتھیا

یہ شاید ۱۹۷۳ء کی بات ہے۔

چرچ گیٹ پر عرب لیگ کے چھوٹے سے آڈیٹوریم میں 'فلم گرم ہوا' کا ایک شو رکھا گیا جس میں صرف پریس والوں کو بلایا گیا تھا۔ 'گرم ہوا' عصمت چغتائی کی کہانی ہے جو تقسیم ہند کے فوراً بعد ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور ذہنی کشمکش کو بے حد ایمانداری کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ یہ فلم ۱۹۷۲ء میں تیار ہو چکی تھی مگر ریلیز کئی سال کے بعد ہوئی کیوں کہ سنسر بورڈ کو ڈر تھا کہ جیسے ہی یہ فلم سنیما ہال تک پہنچے گی، ہندو مسلم جذبات بھڑک اٹھیں گے اور فسادات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس لیے 'گرم ہوا' پر پابندی لگا دی گئی تھی۔

شو کے بعد شمع زیدی اور ایم۔ ایس۔ ستھیو کو جنھوں نے یہ فلم بنائی تھی صحافیوں نے گھیر لیا۔ زیادہ تر لوگوں کا کہنا تھا کہ فلم میں فساد پھیلانے والی کوئی بات ہے ہی نہیں۔ پھر یہ زیادتی کیوں؟

ستھیو نے ایک سوکھی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا:

"NFDC کی فلم ہے۔ انہیں حق ہے کہ وہ ریلیز کریں یا نہ کریں!"

مگر شمع کا جواب دوسرا تھا۔

"جب تک سنسر سرٹیفکٹ نہیں مل جاتا، ہم اسی طرح جگہ جگہ پرائیوٹ شو کرتے رہیں گے۔ یہ فلم لوگوں تک پہنچنی ہی چاہیے!"

میں خوش ہو گیا۔ یہ ہوئی نا بات!

یہ وہی اسپرٹ ہے جو بلراج ساہنی کے کردار میں عصمت آپا نے رکھی تھی۔ حق کی لڑائی سے بھاگ جانے والے نہیں، ڈٹ جانے والے جیتتے ہیں۔ میں فلم اور فلم بنانے والوں سے اتنا متاثر تھا کہ اسی رات ایک مضمون لکھا: 'اس گرم ہوا کو آنے دو!'

یہ مضمون میرے اخبار اردو رپورٹر میں چھپا تھا اور بعد میں کئی اخبارات میں حوالے کے ساتھ شائع بھی کیا گیا تھا۔ اس اخباری شور وغل کا اثر یہ ہوا کہ اندرا گاندھی بھی فلم دیکھنے پر مجبور ہو گئیں اور فلم نہ صرف ان کو پسند آئی بلکہ اسے فوری ریلیز کا حکم بھی جاری کر دیا۔

کوئی بھی کہانی کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو اگر دلچسپ ہو تو کوئی نہیں بھولتا کہ وہ کب، کہاں اور کیسے شروع ہوئی تھی۔ مجھے بھی یاد ہے کہ شمع سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۳ء میں ہوئی تھی۔ یہ ملاقات بس ویسی ہی تھی جیسے ایک مشہور شخصیت اور ایک اخباری رپورٹر کی ہوتی ہے۔ یعنی کچھ سوال کچھ جواب اور بس!

یہ وہ زمانہ تھا جب بیگم قدسیہ زیدی کی موت کے بعد ان کا بنایا ہوا ہندوستانی تھیٹر جو اردو ہندی کا پروفیشنل تھیٹر گروپ تھا، دم توڑ رہا تھا اور شمع اس میں روح پھونکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ اپنا ناٹک 'مدرا راکشس' لے کر ممبئی آئی تھیں۔ ان کا انٹرویو یکم اگست ۱۹۶۳ء کو انقلاب میں شائع ہوا تھا۔ اسکا تراشہ میرے سامنے ہے۔

"بڑی بڑی اور کھوئی کھوئی آنکھوں والی شمع زیدی نے بتایا کہ ہندوستانی زبان کا کوئی ایسا پیشہ ور تھیٹر گروپ نہیں ہے جو تھیٹر کے جدید رجحانات کے ساتھ ساتھ قدیم سرمائے کو بھی پیش کرتا رہے ان کی خواہش ہے کہ ہندوستانی تھیٹر کی اپنی ایک عمارت ہو۔ تا کہ ان کا گروپ لگاتار ڈرامے پیش کرتا رہے۔ عمارت کے لیے مہاراشٹر کی حکومت ایک لاکھ کی گرانٹ منظور کر چکی ہے اور اتنا ہی سرمایہ جمع کیا جا رہا ہے تا کہ تھیٹر کا کام شروع ہو سکے۔!"

مگر شمع کی کھوئی کھوئی آنکھوں کے خواب پورے نہ ہو سکے۔ نہ گرانٹ ملی، نہ سرمایہ جمع ہوا۔

اس انٹرویو کے بعد ایک عرصے تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی کیوں کہ شمع دلی میں رہتی تھیں اور ممبئی میں ان کا آنا جانا بہت کم ہوتا تھا اور یوں بھی ملاقات کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ہائے وہ بھی کیا زمانہ رہا ہوگا جب ملاقات خود ایک وجہ ہوا کرتی تھی۔ شمع دلی ڈورڈرشن میں کام کر رہی تھیں۔ جہاں ان کو بالکل مزہ نہیں آ رہا تھا۔ کیوں کہ سرکاری پابندیوں نے ایسا جکڑ رکھا تھا کہ سانس لینے کے لیے بھی اجازت لینی پڑتی تھی۔

ان کے شوہر تھیو صاحب ڈائیرکٹر اور ڈیزائنر تھے مگر وہ بھی دہلی میں بے کار اور بیزار تھے کیوں کہ وہ ہندوستانی تھیٹر ختم ہو چکا تھا جس کے لیے وہ اپنا وطن میسور چھوڑ کر دلی آئے تھے اور ان کے سارے ساتھی بھی بکھر چکے تھے چناں چہ دونوں نے ہمت اور سامان باندھ کر اس سمندر میں چھلانگ لگا دی جسے ممبئی کہا جاتا ہے۔ یہ شہر ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہاں کی ترقی پسند تحریک سے اور خاص طور سے انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن سے بیگم قدسیہ زیدی اور ہندوستانی تھیٹر کے پرانے اور گہرے رشتے تھے۔ اس لیے جب شمع اور تھیو ممبئی کو گھر بنانے آئے تو انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس زمانے کے ترقی پسندوں میں ایک عجیب صفت تھی کہ غیروں کے لیے بھی دامن دل پھیلا دیا کرتے تھے۔ شمع تو پھر اپنی تھیں۔

ممبئی اپٹا کے لیے شمع نے پہلا ناٹک 'ایک چادر میلی سی' کیا تھا۔ یہ ناٹک راجندر سنگھ بیدی کے ناول پر مبنی ہے اور بیدی صاحب نے خود شمع کی مدد سے ناول کو ڈرامائی شکل دی تھی۔ یہ ڈراما آج تک اپٹا کے کارناموں میں گنا جاتا ہے۔ میں نے اس پر بھی ایک مضمون لکھا تھا مگر پتہ نہیں وہ تراشہ کہاں گیا۔

شمع کے پہلے انٹرویو سے لے کر گرم ہوا کی ریلیز تک تقریباً ۱۲ر سال کا عرصہ ہے اس دوران میری اور شمع کی ملاقاتیں بھی درجن بھر سے زیادہ نہیں ہیں۔ یہ آمنا سامنا زیادہ تر اپٹا کے کسی شو پر یا کیفی صاحب کے گھر پر ہو جایا کرتا تھا۔

کیفی صاحب کا گھر کیا تھا بقول شوکت آپا کے 'غریبوں کا کلب' تھا صبح سے رات تک بھانت بھانت کے آنے جانے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ جتنے لوگ اتنی ہی باتیں اور اتنی ہی

فرمائشیں! مگر سلام کرنا چاہیے کیفی صاحب اور آپا کو، کبھی ان کی آنکھوں میں سوال یا ماتھے پر بل نہیں آیا! میں تو کبھی کبھار ہی چلا جاتا تھا مگر شمع کی زیادہ تر شامیں وہیں گزرتی تھیں کیوں کہ گھر بھی قریب تھا اور کیفی صاحب بھی!

شمع بہت کم بولتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جب بولتی ہیں اور جو بولتی ہیں وہ ایسا ہوتا ہے کہ اچھے اچھے بولنے والے بھی دیر تک بولنے کے قابل نہیں رہتے۔

کیفی صاحب کے برآمدے میں جو ایک طرح سے اُن کا دیوان خانہ بھی تھا۔ کسی کونے میں بیٹھی شمع بھی دکھائی دیتیں۔ مگر وہ جس طرح بیٹھی ہوئی ہوتی تھیں اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ بیٹھی ہوئی نہیں ہیں بلکہ رکھی ہوئی ہیں۔ چہرہ جیسے سادہ کاغذ، ہونٹ بند، جسم بے حرکت۔ بس پلک جھپکانے اور کبھی کبھی انگلیاں ہلانے سے سراغ لگتا تھا کہ وہ جاگ بھی رہی ہیں اور سب کچھ بہت غور سے سن بھی رہی ہیں یعنی سچ مچ ہمہ تن گوش ہیں۔

شمع مجھے دیکھتی تھیں مگر ان کی نظریں مجھ پر سے پھسل جایا کرتی تھیں یا پار نکل جاتی تھیں اور میں انہیں دیکھتا اور سوچتا تھا کہ یہ ایسی کیوں ہیں۔ لڑکیاں کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں ان کے چہرے پر رنگ روغن سے جو نکھار آتا ہے وہ کچھ الگ ہی ہوتا ہے۔ مگر یہ ہیں کہ میک اپ کے نام پہ لپ اسٹک اور کاجل بھی نہیں ہیں بال بھی تیل کو ترسے ہوئے لگتے ہیں اور تو اور ساڑھی بھی پہنی ہوئی نہیں، لپٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اللہ جانے یہ بیزاری ہے بے نیازی ہے یا ادا'

'سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری

ہمارے درمیان یہ برف اس دن پگھلی جس دن انہیں معلوم ہوا کہ میں رام پور کا رہنے والا ہوں۔ انہوں نے انگلی سے اپنا چشمہ اوپر کیا اور مجھے سر سے پاؤں تک اس طرح دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ پھر سر ہلا کر مسکرائیں اور وہ مسکراہٹ ایک نمبر کی تھی شمع کی دو نمبر کی مسکراہٹ انتہائی غصے میں دکھائی دیتی ہے۔

شمع کے والد کرنل بشیر حسین زیدی ریاست رام پور کے وزیر اعلیٰ تھے اور اس وقت تک اپنے عہدے پر رہے جب تک ریاست قائم رہی۔ شمع اسی رام پور دارالسرور میں پیدا ہوئی

تھیں۔ جب ریاست کا خاتمہ ہوا تو زیدی صاحب اور بیگم قدسیہ زیدی دہلی جا بسے اور رام پور سے ان کا کوئی تعلق نہ رہا۔ لیکن شمع نے اپنے وطن سے اپنا رشتہ کبھی نہیں توڑا۔ وہ آج بھی رام پور کے محلوں، محلوں اور محل والوں کا، گلی کوچے بازاروں کا، باورچیوں، قوالوں، چار بیت گانے والوں اور چاقو ٹوپی بنانے والوں کا ذکر اس والہانہ انداز سے کرتی ہیں کہ لگتا ہے کوئی پرانا عاشق اپنی محبوبہ کی جوانی کو یاد کر رہا ہو۔

رام پور کی بلائے جاں ہے ہر بات

اَمارت کیا ، عمارت کیا ، ادا کیا

آج بھی ایسا ہوتا ہے کہ ذکر چھڑ جائے تو ہم دونوں گھنٹوں اپنی یادوں کی دھول جھاڑتے رہتے ہیں اور اس شہر کو یاد کرتے ہیں جو ترائی کی پہاڑیوں کے نیچے ایک چھوٹی سی جنت ہوا کرتا تھا۔ شمع موڈ میں ہوتی ہیں تو ایسی باتیں بھی بتا دیتی ہیں جو ریاست کے زمانے میں state secret کا درجہ رکھتی تھیں۔ وہ آواز دبا کے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہتیں:

''تمہیں معلوم ہے۔ ہمارے ابا نہیں ہوتے تو یہ بیگم اختر بھی نہیں ہوتیں!''

''اچھا؟ وہ کیسے؟'' میں آنکھیں پھیلا دیتا۔

''ارے وہ نواب صاحب عاشق ہو گئے تھے ان پر۔ زبردستی شادی کرنا چاہتے تھے۔ محل میں بند کر دیا تھا۔ ہمارے ابا کو رحم آ گیا۔ بیگم صاحب کو پردے والی گاڑی میں بٹھا کر آزاد علاقے میں پہونچا دیا تھا۔ جہاں نواب صاحب کچھ نہیں کر سکتے تھے!''

میں ہنس دیتا۔

''خوش قسمت ہو کہ نواب کو معلوم نہیں ہوا، ورنہ زیدی صاحب کے ساتھ ان کے بیوی بچوں کو بھی پھانسی چڑھا دیتا۔ ہندوستانی سنگیت کو زیدی صاحب کا احسان ماننا چاہیے کہ بیگم اختر ان کی وجہ سے بچ گئیں!

شمع بڑی سنجیدگی سے سر ہلاتی ہیں:

"ہاں یہ تو ہے!"

جس زمانے میں شمع سے میل ملت بڑھی وہ میری پیغمبری کا زمانہ تھا۔فاقے بھی تھے اور مستی بھی یعنی فاقہ مستی کا عالم تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔غالبؔ نے کہا تھا:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

راہبر کو پہچاننے کی کوشش اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ وہ راستہ نہیں جانتے تھے مگر یہ معلوم تھا کہ منزل کہاں ہے۔

صحافت کی گلی چھوڑ کر میرا حال غالبؔ سے زیادہ خراب تھا۔مجھے تو یہی نہیں معلوم تھا کہ جانا کہاں ہے۔رہبر اور راستے کا سوال تو بعد میں اٹھتا مگر اللہ بھلا کرے شمع کا انہوں نے میرے ساتھ وہی کیا جو زیدی صاحب نے بیگم اختر کے ساتھ کیا تھا انہوں نے بھی مجھے ایک گاڑی میں بٹھایا اور آزاد علاقے میں پہنچا دیا۔یعنی ستیہ جیت رے سے ملا دیا۔

شمع نے مجھے ستیہ جیت رے تک کیسے پہنچایا اور ہم دونوں نے مل کر شطرنج کی بساط پر کیا کارنامے کیے، اسکی تفصیل میرے ایک خاکے 'کیا آدمی تھا رے' میں موجود ہے۔اس لیے صرف وہی قصے بیان کروں گا جو کسی دلچسپی کا باعث ہیں۔شطرنج کے کھلاڑی کی ٹیم میں شمع کو بہت اہم حیثیت حاصل تھی۔ڈائیلاگ کا ذکر تو میں کر ہی چکا ہوں۔فلم کے کاسٹیوم بھی انھوں نے ہی ڈیزائن کیے تھے اور اس پر بہت ریسرچ کی تھی کہ سارے ملبوسات میں زمانے اور علاقے کے حساب سے کوئی غلطی نہ ہو۔یہ کپڑے ہر اعتبار سے اس قدر صحیح اور خوبصورت تھے کہ آج تک ان کی مثال اور حوالے دیئے جاتے ہیں۔فلم کے آرٹ ڈائرکٹر بنسی چندر گپت تھے۔جو شمع کی خوش مذاقی، سلیقے اور اودھ کے بارے میں ان کی معلومات سے بہت متاثر تھے اس لیے انھوں نے Set Decoration کی ذمہ داری بھی شمع ہی کو سونپ دی تھی۔جس کے لیے وہ سارے شہر میں چکراتی پھرتی تھیں۔کباڑیوں کی دوکانیں، نوادرات کے شوروم اور پرانی حویلیاں، کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں شمع ایک کندھے سے چمڑے کا بڑا سا بیگ اور دوسرے

کندھے سے ساڑی کا پلو لٹکائے نہ پہنچ جاتی ہوں۔

مجھے پرانے سامان کی دوکانیں علی بابا کے طلسمی غار کی طرح لگتی ہیں۔ جیسے ہی سم سم کھلتا ہے ایک نئی دنیا دکھائی دیتی ہے۔ ایک ایسی دنیا جو ختم ہو چکی ہے مگر کچھ نشانیاں چھوڑ گئی ہے۔ ہر شئے ایک کہانی کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ ہر چیز ایک آئینہ لگتی ہے۔ جس میں گذرے ہوئے لمحوں نے اپنے چہرے دیکھے ہوں گے۔

سستے داموں لے تو آتے لیکن دل تھا، بھر آیا
جانے کس کا نام کھدا تھا پیتل کے گلدانوں پر

شمع نے میر اور مرزا کے کمروں، دالانوں اور دیواروں کے لیے اِس محبت سے چیزیں جمع کرتیں کہ ایسا لگتا جیسے کوئی ماں اپنی پیاری بیٹی کے لیے جہیز جمع کر رہی ہو۔ میں بھی اکثر اس نیک کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے ان کے ساتھ ہو لیا کرتا تھا اور میں نے ایسے ایسے منظر دیکھے ہیں کہ اللہ اللہ۔

ایک دفعہ شمع اور میں ٹوپیاں تلاش کر رہے تھے۔ کلکتہ میں مسلمان بستیاں تو بہت ہیں مگر کہیں لکھنؤ کی دوپلی ٹوپیاں نہیں مل رہی تھیں۔ کسی نے بتایا کہ بڑی مسجد کے پاس ٹوپی والوں کی بہت سی دوکانیں ہیں وہاں ضرور مل جائیں گی۔ ہم دونوں وہاں پہونچے اور لکھنوی ٹوپیاں تلاش کرنے لگے۔ مجھے کتابوں کی ایک دوکان نظر آئی اور اردو کی کتابیں دکھائی دیں تو میں دیکھنے کے لیے ذرا دیر کو رک گیا۔ تھوڑی دیر بعد پلٹ کر دیکھا تو شمع غائب تھیں میں نے سوچا کسی ٹوپی والے کی دوکان پر بیٹھی ہوں گی۔ مگر وہ کہیں نہیں تھیں کئی چکر لگائے لیکن وہ کہیں بھی نظر نہیں آئیں تو میں پریشان ہو گیا۔ گاڑی کافی دور کھڑی تھی وہاں بھی جا کر دیکھا گاڑی تو تھی مگر شمع نہیں تھیں۔ میں جھنجھلا گیا عجیب آدمی ہیں بول کے جاتیں تو کیا مصیبت آجاتی۔ اچانک شمع دکھائی دیں وہ ایک ٹوپی والے کی دوکان کے اندر کونے میں سوئی دھاگہ لیے بیٹھی تھیں اور کاریگر کو دوپلی ٹوپی سی کر دکھا رہی تھیں کہ اس کا Shape کیسا ہوتا ہے اور سلائی کیسے کی جاتی ہے۔

میں نے پوچھا 'یہ تم کیا کر رہی ہو۔ فرمایا:

'پھر کیا کروں؟ ٹوپی کی دوکان لے کر بیٹھے ہیں مگر دوپلّی ٹوپی اور رام

پوری ٹوپی کا فرق بھی نہیں جانتے۔!'

پر فکشن شمع کی ضرورت نہیں شاید فطرت ہے!

شطرنج کی شوٹنگ کے دوران ہم لوگوں کا ایک چھوٹا سا کلب بن گیا تھا۔ شام ڈھلتی تو نیوکیپٹل ورتھ ہوٹل میں جلسے جمتے۔ (Sound Recordist) نریندر سنگھ خود جتنے عمدہ آدمی ہیں ان کا Taste بھی اتنا ہی اچھا ہے۔ اس لیے مے خانہ ان کے روم میں سجتا اور ہم سب صوفوں اور قالینوں پر پھیل جاتے۔ ان میں شمع ہوتیں، بچوں جیسی مسکراہٹ والے بنسی دا ہوتے، شومندو رائے اور انل چٹرجی ہوتے اور ہاں زلفوں کو لہراتے، داڑھی پر ہاتھ پھیرتے اور زور زور سے ہاتھ ہلا کر گرما گرم سیاسی تبصرے کرتے ہوئے پروڈیوسر سریش جندل ہوتے۔ کبھی کبھی کوئی اسٹار بھی شریک ہو جاتا۔ جب رات بھیگنے لگتی تو سریش جندل شطرنج کے چھوٹے سے کنبے کو گاڑیوں میں بھرتے اور کسی نئے ریستوراں کی کھوج میں نکل پڑتے۔ سریش نے اپنے یونٹ کو جو عزت دی میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی۔ عجیب دِل دار پروڈیوسر تھا۔

ان محفلوں میں شمع ایک گلاس اور ایک کونا پکڑ کے بیٹھ جاتی تھیں اور سب کی باتیں پلکیں جھپکا جھپکا کے اس طرح سنا کرتی تھیں جیسے وہ دوستوں کی بزم نہ ہو بلکہ کوئی نہایت سنجیدہ مجلس ہو اور انھیں ڈر ہو کہ کوئی بات سننے سے چھوٹ نہ جائے اس زمانے میں شمع وہسکی پیا کرتی تھیں اور ان کے پینے کا اپنا تیور تھا جو ان سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ اپنا پہلا پیگ کو بڑے مزے لے لے کر ختم کر دیا کرتی تھیں۔ دوسرے پیگ پر رفتار ذرا کم ہو جاتی چھوٹی چھوٹی چسکیاں لگاتی رہتیں اور جب ان کا دوسرا گلاس آدھا خالی ہو جاتا تو اسے احتیاط سے آس پاس کسی میز پر رکھ کے لیٹ جاتیں۔ لیٹنے کے لیے جگہ کی کوئی قید نہ ہوتی۔ پلنگ ہو صوفہ ہو، قالین ہو، شمع بی بی ذرا سی جگہ بنا کے دراز ہو جاتیں اور اکثر سو بھی جاتی تھیں۔ لوگ پیتے پلاتے شور مچاتے رہتے مگر شمع اپنے ڈیڑھ پیگ کی مستی کے مزے لیتی رہتیں لیکن جب کھانے کا وقت آتا اور کوئی

آواز دیتا۔ شمع اٹھو کھانا لگ گیا یا کھانا کھانے جانا ہے تو وہ فوراً اٹھ کے بیٹھ جاتیں۔ جلدی سے اپنا چشمہ لگا کے گلاس ڈھونڈتیں اور اس میں بچی ہوئی آدھا گلاس وہسکی ایک سانس میں ختم کر کے ایک نہایت معصوم مسکراہٹ کے ساتھ چاروں طرف دیکھتیں اور کھانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوتیں، لیکن ایک دفعہ ان کی اس عادت نے خاصی سنسنی پھیلا دی تھی۔ ہوا یوں کہ جب شطرنج کی شوٹنگ لکھنؤ میں ہو رہی تھی تو وہاں کے کلکٹر نے اپنے بنگلے پر مدعو کیا۔ کوئی ایکٹر تو گیا نہیں مگر سریش جندل، بنسی دا، شمع اور میں مانک دا کے ساتھ کلکٹر صاحب کی لکھنوی مہمان نوازی کا مزہ لینے کے لیے پہنچ گئے۔

دسمبر کی رات، کڑاکے کی سردی انگیٹھی میں دہکتے کوئلوں کی آگ اور ہاتھوں میں آتش سیال ایسی راتیں پرانے ناولوں میں تو بہت ملتی تھیں مگر ہمارے زمانے تک آتے آتے تقریباً ختم ہو چکی تھیں۔ اس لیے میں گھونٹ گھونٹ اور لمحے لمحے کا مزہ لے رہا تھا۔

سب لوگ کان لگائے اس دلچسپ کہانی کو سن رہے تھے جو مانک دا سنا رہے تھے باقی سب لوگ تو کرسیوں پر بیٹھے تھے مگر کلکٹر صاحب ان کی بیگم اور شمع ایک دیوان پر براجمان تھے۔ اچانک شمع نے کلکٹر صاحب سے کہا:

"آپ ذرا اٹھیے!"

وہ بے چارے پتہ نہیں کیا سمجھے کہ گھبرا کے کھڑے ہو گئے۔ شمع نے ایک کُشن سر کے نیچے رکھا اور لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں میں نے دیکھا شمع کا گلاس آدھا ہو چکا تھا۔ کلکٹر صاحب نے پریشان ہو کر پوچھا:

"انہیں کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟ ہم ابھی ڈاکٹر کو بلواتے ہیں۔"

مانک دا نے بنسی چندر گپت کی طرف اور انھوں نے سریش جندل کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں سوال تھا کہ جواب کیا دیا جائے۔ سریش نے بڑے اطمینان سے اپنی زلفوں کو سمیٹا دوسرا ہاتھ داڑھی پر پھیرا اور فرمایا:

"کچھ نہیں۔ بہت تھک گئی ہیں۔ ابھی اٹھ جائیں گی!"

کلکٹر صاحب کچھ دیر کھڑے پریشانی سے شمع کو دیکھتے رہے پھر بیٹھے اور باتوں میں لگ گئے مگر ان کی توجہ شمع سے نہیں ہٹی۔ جب کھانا لگا تو میں نے کندھا ہلا کر کہا:

"شمع۔ کھانا!"

وہ اٹھیں، جلدی سے چشمہ لگایا اور اپنا آدھا خالی گلاس لے کے اس طرح بیٹھ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ کلکٹر صاحب کی بیوی نے بڑی محبت سے پوچھا:

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

شمع نے آنکھیں جھپکائیں اور بولیں۔

"میری طبیعت کو کیا ہوا؟"

اب پلکیں جھپکانے کی باری کلکٹر صاحب کی بیگم کی تھی۔

اب تک میں نے اور شمع نے مل کر انیس مکمل اسکرپٹ لکھے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اسکرین کی صورت ان میں سے نو ہی نے دیکھی ہے۔

مجھے شمع کے ساتھ کام کرنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ ہم دونوں نے کام کرنے کا ایک طریقہ طے کر لیا ہے اور ہم دونوں کے کردار بھی طے ہو چکے ہیں۔ شروع شروع میں جب ہم نے ساتھ میں لکھنا شروع کیا تو Laptop نہیں آیا تھا۔ شمع کے پاس ایک Portable Remington ٹائپ رائٹر تھا۔ جسے وہ لاد کر ہر جگہ لیے پھرتی تھیں۔ جب کبھی لکھنے کا وقت آتا تو کچھ یوں ہوتا کہ پہلے سین پڑھا جاتا سین سن کر اگر شمع کا سر ہل جاتا تو یہ سگنل ہوتا کہ گاڑی آگے بڑھ سکتی ہے سگنل نہ ملنے کی صورت میں سین کی ٹھوک پیٹ، مرمت، مباحثہ اور کبھی کبھی جھگڑا۔ جب یہ سب ہو چکتا تو وہ Remington کے کی بورڈ پر انگلیاں رکھ کر میرے بولنے کے انتظار میں آنکھیں بند کر لیتیں۔ اس وقت ان کے چہرے پر وہی معصوم سنجیدگی ہوتی جو انڈوں پر بیٹھی ہوئی کبوتری کے چہرے پر ہوتی ہے اور جسے یقین ہوتا ہے کہ اس کی محنت اور محبت بے جان میں جان ڈال سکتی ہے۔ اس دوران میں اپنے دماغ میں لفظوں کو تولتا، ترتیب دیتا اور پھر بولتا، شمع کی انگلیاں چل پڑتیں اور اس طرح جملے پر جملے اور مکالمے پر مکالمہ بنتا چلا جاتا لیکن

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں اپنے دماغ کے خزانے میں سے ہیرے چن کر نکالتا اور شمع چپ چاپ دیوار کو دیکھتی رہتی میں پوچھتا۔

'کیا ہوا؟ تم لکھتی کیوں نہیں؟'

اور تڑ سے جواب آتا ہے:

'اچھا نہیں ہے!'

یہ تین لفظی فیصلہ ایک ایسی عدالت کا ہوتا جس کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی جا سکتی۔ پھر بھی کوشش کرتا:

'کیا خرابی ہے؟'

'کہانا، اچھا نہیں ہے!'

چلیے بات ختم ہوئی اب اس سنگ آستاں پر سر پھوڑنے سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔ اس لیے کچھ اور غور، کچھ اور غوطہ خوری۔ یہاں تک کہ وہ موتی مل ہی جاتا جسے شمع کی انگلیاں اسکرپٹ میں جڑ دیتی۔

میں جب کبھی شمع کے بارے میں سوچتا ہوں تو ذہن کے اسکرین پر ایک عجیب سی تصویر ابھرتی ہے۔ زندگی کے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے تو ایک خاتون اس طرح داخل ہوتی ہیں جیسے ہمیشہ سے یہیں تھیں ،بس تھوڑی دیر کے لیے باہر چلی گئی تھیں۔ مگر یہ میری سوچ ہے۔ میں جس طرح سوچتا ہوں، دوسرے نہیں سوچتے۔

'اے یہ شمع زیدی کتنی بد دماغ ہیں کسی سے سیدھے منھ بات ہی نہیں کرتی ہیں۔'

'نک چڑھی ہیں۔!'

'پتہ نہیں خود کو کیا سمجھتی ہیں!'

'زیادہ پڑھنے لکھنے سے دماغ خراب ہوگیا ہے!'

اب کیا کہا جائے دوسروں کی رائے دوسروں کی ہے۔

سنا کرو میری جاں اِن سے اُن سے افسانے

سب اجنبی ہیں یہاں کون کس کو پہچانے

یہ ان لوگوں کے تبصرے ہیں جو شمع کو نہیں پہچانتے۔ وہ سچ میں کیا ہیں یہ جاننے کے لیے ان کے قریب بلکہ بہت قریب جانا ضروری ہے اور یہ کام آسان نہیں ہے۔ ان کے دل کا دروازہ باہر سے نہیں کھلتا۔ صرف اندر سے کھلتا ہے اور وہ اس دروازے کو ہر ایک دستک دینے والے پر کھولتی بھی نہیں ہیں۔

میں ان چند خوش نصیبوں میں سے ہوں جن پر یہ دروازہ کھلا اور آج تک کھلا ہوا ہے۔ شمع کی ایک بہت بڑی خوبی جس کا اعتراف ان کے مخالفین بھی کرتے ہیں ان کی صاف گوئی ہے۔ وہ گھما پھرا کر بات کرنا بالکل پسند نہیں کرتی ہیں اور سچ کی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ وہ جب ننگ دھڑنگ سامنے آتا ہے تو زوردار جھٹکا لگتا ہے اور شمع بی بی ایسے جھٹکے دینے کے لیے بدنام ہیں۔ کبھی کبھی ان کی حق گوئی ایسے حالات پیدا کر دیتی ہے جو دلچسپ بھی ہوتے ہیں اور پریشانی کا باعث بھی۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب ایم ایس ستھیو اپنی فلم 'سوکھا' بنا رہے تھے۔ یہ کرناٹک کے بیدر گلبرگہ علاقے میں پڑنے والے قحط اور اس پر کھیلی جانے والی سیاست کی کہانی ہے۔ ہم نے ستھیو سے کہا:

'یہ جس علاقے کی کہانی ہے ہم اسے نہیں جانتے، نہ یہ جانتے ہیں کہ وہاں کا ماحول کیا ہے کلچر کیا ہے اور کیسی زبان بولی جاتی ہے۔ اس لیے اس فلم کا اسکرپٹ ممبئی میں نہیں، بیدر جا کر لکھنا چاہیے!'

ستھیو بھی چاہتے تھے کہ ان کی فلم میں حقیقت کا رنگ گہرا ہو اس لیے فوراً مان گئے اور ہم دونوں کو بوریا بستر اور اسکرپٹ کے ساتھ روانہ کر دیا گیا۔ شمع نے آئیڈیا دیا۔

'بس سے چلتے ہیں یار، راستے میں گاؤں کھیڑے دیکھتے چلیں گے، بہت مزہ آئے گا!'

میں راضی ہو گیا۔ کسی علاقے کا اصلی روپ اس کے دیہات ہی میں تو دکھائی دیتا ہے۔

بس اسٹیشن پہونچے تو سامنے ہی ایک بس کھڑی تھی جس پر بیدر کا بورڈ لگا تھا بس کی حالت کچھ اچھی نہیں تھی مگر مجبوری تھی کیوں کہ اس زمانے میں لکژری بسیں اِکّا دُکّا رستوں پر ہی چلتی تھیں۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ بیدر کا سفر کچھ ہی گھنٹوں کا ہے۔ مگر ہماری بس نے خدا جانے کون سا Route پکڑا تھا کہ ہر چھوٹے بڑے گاؤں میں جا کر رک جاتی تھی اور ہلنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ کم بخت نے پورا کرناٹک گھمایا اور تقریباً ۱۱ گھنٹے میں بیدر پہنچایا اور کمر کے بارہ بجا دیئے۔

جب ہم بیدر پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ گیسٹ ہاؤس ڈھونڈا جہاں تھیو کے دوست، مشہور کنڑ رائٹر راما سوامی نے ہمارے رہنے کا بندوبست کر دیا تھا۔ یہ گیسٹ ہاؤس جس کا نام اب یاد نہیں۔ ایک پرانی حویلی تھی جس کے مالک نواب صاحب کہلاتے تھے اور خود بھی حویلی کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ دوسرے دن ناشتے کی میز پر نواب صاحب سے ملاقات ہوئی۔ گول مٹول آدمی تھے اور دیکھنے میں کچھ ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر جیسے لگتے تھے۔ بہت سنبھل سنبھل کر بلکہ چبا چبا کر حیدرآبادی لہجے میں اردو بولتے تھے اور ایسے ایسے لفظ استعمال کرتے تھے کے فوراً سمجھ میں آجاتا تھا کہ مولوی عبدالحق نے اردو انگلش ڈکشنری حیدرآباد میں بیٹھ کر کیوں تیار کی تھی۔ بیدر میں دو تین دن تو خیریت سے اور پرانی عمارتیں دیکھتے گزرے چوتھے دن وہ واقعہ ہوا جس کے لیے میں نے اتنی لمبی تمہید باندھی ہے یعنی شمع بی بی کی صاف گوئی!

ہوا یوں کہ 'سوکھا' کے ڈائلوگ لکھے جا رہے تھے اس فلم میں ایک کردار تھا جو ہر بات میں گالی دیا کرتا تھا ہم نے سوچا کہ اس کیرکٹر کی زبان تو اردو ہی رکھتے ہیں مگر گالیاں کنڑ زبان کی استعمال کرتے ہیں۔ کیوں کہ میرا مشاہدہ ہے کہ زیادہ تر لوگ گنتی اور گالی میں اپنی مادری زبان ہی استعمال کرتے ہیں۔

اس شام حسب معمول شمع ریمنگٹن بدست بیٹھی تھیں اور میں اسکرین پلے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اچانک نواب صاحب کا چھوٹا بیٹا دکھائی دیا۔ سترہ اٹھارہ سال کا خوبرو لڑکا تھا شاید نماز

پڑھ کے آرہا تھا کیوں کہ ٹوپی ہاتھ میں تھی ۔ میں نے کہا۔

''میاں یہاں آئیے۔آپ کو ہماری مدد کرنی ہے!''

''جی کہیے!'' وہ آیا اور کرسی گھسیٹ کر میرے پاس بیٹھ گیا۔

''آپ کو کنڑ زبان کی کچھ گالیاں آتی ہیں ۔؟''

میں نے پوچھا۔ بے چارہ شریف بچہ گھبرا گیا۔ تو میں نے وضاحت سے اپنی ضرورت بیان کی وہ نرم پڑ گیا۔ مسکرایا اور کنڑ میں ایک گالی دی۔

''اس کا مطلب کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا مطلب ہے۔گدھا!''۔اس نے سمجھایا۔

''نہیں بھائی ذرا موٹی والی گالی چاہیے۔کیرکٹر غنڈہ ہے۔''

اس نے پھر کچھ گالیاں بتائیں جن کا مطلب تھا بے وقوف، نالائق، کام چور وغیرہ....

شمع چپ چاپ اس لڑکے کو اس طرح دیکھتی رہیں جیسے مریض ڈاکٹر کو دیکھتا ہے اور میں پریشان ہوتا رہا کہ ان روکھی پھیکی گالیوں سے کیا کام چلے گا۔ اچانک شمع نے لڑکے کی آنکھوں میں دیکھا اور ایک ایسی خوف ناک گالی دی کہ میرے کان بھی جھنجنا اٹھے۔ اس لڑکے کی حالت تو دیکھنے کی تھی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے شمع کو دیکھا جو نہایت معصومیت سے جواب کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس نے بوکھلا کے اٹھنے کی کوشش کی اور کرسی سے گرتے گرتے بچا پھر سنبھل کے ایسا بھاگا کہ ٹوپی کرسی پر ہی رہ گئی۔ شمع مسکرائیں اور بولیں:

'چلو یار۔ دوسرا سین نکالو!'

دوسرے دن سویرے نواب صاحب نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا اور فرمایا:

''آپ لوگاں اپنے خیام کا انتظام کدھر تو بھی کرلیں!''

میں نے وجہ پوچھی تو نواب صاحب پھٹ پڑے:

''یہ جو کاتون ہیں نا آپ کے ساتھ۔ انہوں شریفوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے جی۔ کیا گندی زبان ہے بابا۔ عورت ہو کے پوٹٹے کو ایسی گالی

دیے کہ انہوں بخار آ گیا۔آپ سامان بڑھائیں اپنا حضت!"

میں نے نواب صاحب کو بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اتنے غصے میں تھے کہ بس چلتا تو شمع کی زبان کٹوا دیتے اور مجھے کوڑے لگواتے۔! شمع نے سنا تو بہت زور سے کھل کھلا کے ہنسیں اور نواب صاحب کو ایک دل دہلا دینے والی گالی دے کر بولیں:

"چلو۔دوسری جگہ دیکھتے ہیں!"

شمع کے سچ بولنے کا انداز کیسا ہی کیوں نہ ہو۔لوگ اسے پسند کریں یا نہ کریں لیکن وہ جو کچھ بولتی ہیں ایک ایسے آئینے کی طرح ہوتا ہے۔جس میں لوگ اپنے چہرے دیکھ سکتے ہیں۔

چند سال پہلے کی بات ہے۔ پرسار بھارتی کی طرف سے دوردرشن کے اردو چینلز کے پروگراموں کو بہتر بنانے کے لیے ایک سہ روزہ ورک شاپ کا انتظام کیا گیا۔لکھنؤ میں ہونے والے اس ورک شاپ کے ذریعہ ایسے طریقے اور سلیقے طے کیے جانے تھے۔جن کی مدد سے اردو کے پروگرام زیادہ دلچسپ اور مقبول ہوسکیں ورک شاپ میں دوردرشن کے ۱۶راِسٹیشنوں کے نمائندے شریک ہورہے تھے اُردو ورک شاپ لینے کی ذمہ داری میرے اور شمع کے اوپر ڈالی گئی تھی۔افتتاح والے دن پرسار بھارتی اور دوردرشن کے سارے بڑے عہدیدار اور کچھ بہت اہم شخصیات جمع تھیں جن میں ہمارے دوست مظفر علی خاص طور سے قابل ذکر ہیں جن کی کوشش سے اس ورک شاپ کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔باری باری سبھی بول رہے تھے کچھ شکایتیں کررہے تھے کچھ لوگ ہدایتیں دے رہے تھے۔بات چلتے چلتے اس جگہ آگئی کہ ٹی وی پر عورتوں کے لیے کوئی معقول پروگرام پیش نہیں کیا جاتا۔بس کھانا بنانے کی ترکیبیں بتائی جاتی ہیں! ساس بہو کی سازشیں دکھائی جاتی ہیں۔بہت ہوا تو کچھ خواتین کو ایسے زرق برق لباس میں دکھا دیا جاتا ہے جو اب کہیں نہیں پہنے جاتے۔شمع کی باری آئی تو وہ مائک پر آئیں اور بنا کسی آداب سلام یا تمہید کے فرمایا:

'اگر آپ لوگوں کو عورتوں سے ہمدردی اور ان کے مسائل سے سچ مچ کوئی دلچسپی ہے تو کچھ عورتوں کو بھی بلا لیا ہوتا!'

میں نے چونک کر ہال پر نظر ڈالی۔ شمع ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ تقریباً سو مردوں کے درمیان صرف پانچ عورتیں تھیں جن میں سے دو ڈائس پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ یعنی شمع اور دوردرشن کی ڈائرکٹر جنرل رینو کاشرما۔

شمع نے کہا:

''جب تک مرد عورتوں کے بارے میں سوچتے رہیں گے، عورتوں کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں کہنا۔''

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کتنے چہروں کے رنگ اترے ہوں گے اور سناٹا کتنا لمبا ہو گا! مگر شمع کا ہتھوڑا کام آیا اور آج کل ڈی ڈی کے پروگراموں میں عورتوں پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ بات اردو چینل کی چل رہی ہے تو ایک بات بتا تا چلوں کہ دوردرشن پر اردو کا چینل شروع کرانے کا سہرا صرف اور صرف شمع زیدی کے سر ہے۔

شمع ہمیشہ اس بات کی شکایت کرتی تھیں کہ ساری زبانوں کے چینلز ہیں تو اردو کا کیوں نہیں ہے۔ چناں چہ ۱۹۸۲ء میں ہم نے ایک 'اردو محاذ' بنایا جس کے صرف دو ممبرز تھے۔ شمع اور میں اور ہم نے اردو محاذ کی طرف سے ہر اس شخص کو اپنی درخواست بھیجی جس کی قومی سیاست یا حکومت میں ذرا سی بھی اہمیت اور حیثیت تھی۔ شروع شروع میں تو ہمیشہ ایک ہی سرکاری جواب آیا کرتا تھا کہ اردو ہندی سے الگ کوئی زبان نہیں ہے اس لیے اسے علیحدہ اور آزاد چینل کی ضرورت نہیں ہے۔ جواب میں ہم یہ بتانے کی کوشش کرتے کہ اردو نہ صرف یہ کہ ایک الگ زبان ہے بلکہ اسکی ثقافت، تہذیب اور تاریخ، دیگر تمام زبانوں سے مختلف ہے۔ اس لیے اسے اس کا حق ملنا چاہیے۔

سب سے زیادہ دلچسپ جواب وزارت اطلاعات ونشریات سے اس وقت آیا تھا جب مرکز میں بی جے پی کی حکومت تھی۔ جواب میں لکھا گیا تھا روزانہ ۲ بجے سے ۲ بج کر پانچ منٹ تک اردو میں خبریں سنائی جاتی ہیں اس لیے اسے ایک علیحدہ چینل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

حکومتوں کے ساتھ اردو کی یہ لڑائی ہم دونوں نے ۴۲ ربرس تک لڑی ہے۔ سرکار پر اردو کا چینل شروع کرنے کا دباؤ اور بھی کئی طرف سے آرہا تھا مگر سرکاری ہٹ دھرمی پر سب سے بڑی چوٹ تب ہی پڑی جب حیدرآباد سے ای ٹی وی اردو شروع ہوا اور اس کے پیچھے بھی جس ہستی کی خاموش جدو جہد کارفرما تھی وہ شمع ہی تھیں۔ وہاں بھی انہوں نے برسوں کوشش کرکے ای ناڈو کے مالک راموجی راؤ کو یہ بات ماننے پر مجبور کر دیا کہ اردو، ہندی سے الگ ایک ایسی زبان ہے جو سارے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ۲۰۰۳ء میں ای ٹی وی اردو کا افتتاح ہوا!

حکومت ہند کو اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے پندرہ اگست ۲۰۰۶ء کو دوردرشن پر اردو چینل کا افتتاح کرنا ہی پڑا۔

ETV پر شمع کو CEO کی کرسی پیش کی گئی تھی جسے انہوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ وہ انتظامیہ کے جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہتی ہیں مگر ایک مشیر کی حیثیت سے وہ ای ٹی وی اردو کے ساتھ برسوں جڑی رہیں اور اس وقت رشتہ توڑا جب چینل کی پالیسی بنانے والے اردو کے نام نہاد ہمدردوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اردو کی تہذیب مشاعرے سے شروع ہوتی ہے اور قوالی پر ختم ہوتی ہے۔ ان حالات میں شمع کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو وہ اپنے خیالات اور نظریات کا خون ہوتے دیکھتی رہیں یا پھر اردو کی بدنصیبی پر ماتم کرتی ممبئی لوٹ آئیں اور شمع ممبئی آ گئیں!

ہر بڑی شخصیت کی طرح شمع کے کردار کے کئی پہلو ہیں، کچھ اچھے، کچھ برے، کچھ دھندلے، کچھ اجلے، ان سب کو سمیٹنے جاؤں تو ان کی سوانح عمری تیار ہو جائے گی جو فی الحال میرا ارادہ نہیں ہے۔ لیکن ان کی شخصیت کا ایک پرت کھولنا ضروری ہے جس سے بہت ہی کم لوگ واقف ہیں۔ جب شمع نے دہلی کو خیر باد کہا اور ہمیشہ کے لیے ممبئی آ گئیں تو ان کا خاندانی نوکر بچن سنگھ بھی ان کے ساتھ آیا۔ کہنے کو بچن سنگھ کا کام صرف کھانا بنانا تھا مگر وہ دور شمع اور میرے Struggle کا دور تھا ان دونوں کے پاس گھر دیکھنے کا وقت ہی نہیں تھا اس لیے گھر کی ساری ذمہ داری بچن پر آ گئی تھی جو

وہ شوق اور ایمانداری کے ساتھ ادا کرتا تھا۔ کچھ دن بعد بچن کی بیوی سوشیلا بھی آگئی اور دونوں نے مل کر شمع اور ستھیو کا سارا گھر سنبھال لیا۔ ظاہر ہے کہ میاں بیوی جہاں ہوں گے ان کے بچے بھی وہیں ہوں گے اور رہیں گے بھی وہیں جہاں ماں باپ ہوں گے۔

ممبئی میں شمع کا گھر بہت چھوٹا تھا۔ بس دو کمرے ایک کچن اور ایک لمبی سی بالکنی اور اس چھوٹے سے گھر میں دس افراد رہا کرتے تھے۔ یعنی شمع، ستھیو ان کی دو بیٹیاں سیما اور شیلی اور ان کے ساتھ تھے بچن سنگھ اس کی بیوی سوشیلا اور ۴ بچے۔ میں اکثر سوچتا اور حیرت کرتا تھا کہ عالی شان کوٹھیوں اور بنگلوں کی رہنے والی شمع اتنی کم جگہ میں اتنے بہت سے لوگوں کے بیچ کیسے رہ سکتی ہیں۔ مگر شاید یہ شمع کے اندر چھپا ہوا سوشلزم تھا جس نے گھر کو کمیون بنا دیا تھا۔ شمع نے بچن کے بچوں کی تعلیم اور تربیت پر اتنی ہی توجہ دی جتنی سیما اور شیلی کی۔ آج بچن سنگھ کے بچے جوان ہو چکے ہیں، لڑکیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں، لڑکے بھی کامیاب ہیں ان کے پاس وہ سب کچھ ہے جو ایک نوجوان کا تصور ہوتا ہے۔ یعنی اپنا گھر، اپنا کاروبار اور ایک چمکتی ہوئی خوبصورت کار۔

بچن سنگھ مر چکا ہے مگر شمع کے گھر سے سوشیلا کا رشتہ آج بھی قائم ہے اور وہ منظر دیکھنے کا ہوتا ہے جب سوشیلا اپنی کار خود ڈرائیو کر کے آتی ہے۔ شمع کے لیے ایک بھاجی اور چند چپاتیاں بنا کر چلی جاتی ہے۔ سننے میں یہ بڑی فلمی سچویشن لگتی ہے مگر حقیقت کہانیوں سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں۔

شمع ان لوگوں میں ہیں جو کبھی بے کار نہیں بیٹھ سکتے، لکھنا پڑھنا، بلکہ بہت سا پڑھنا ان کا دلچسپ مشغلہ ہے فلم، ناٹک اور سیریل سے جو وقت بچ جاتا ہے تو وہ انٹرنیٹ کی دنیا میں چلی جاتی ہیں اور اس وقت تک گشت لگاتی رہتی ہیں جب تک تھک نہ جائیں یا کوئی دوسرا اہم کام نہ آجائے۔

شمع میری محبوبہ نہیں ہیں مگر وہ میری ہم خیال، ہم قدم، ہم قلم، ہم نوا اور ہمدرد ہیں۔ کسی ایک انسان سے ایک ہی وقت میں اتنے سارے رشتے بنانا آسان نہیں ہوتا۔ اس لیے کسی اور رشتے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ شمع کی ذاتی زندگی میں بہت زیادہ اتار چڑھاؤ نہیں آئے

انھوں نے اپنے لیے جو دنیا بنائی ہے وہ بالکل ویسی ہی ہے جیسی انھوں نے سوچی تھی اور وہ اپنی دنیا میں بہت خوش ہیں۔ وہ اپنی ڈگر پر جس رفتار سے پچاس برس پہلے چل رہی تھیں آج بھی وہی ہے۔ نہ رستہ بدلا ہے نہ چال.... وہ بہت سویرے اٹھتی ہیں۔ سمندر کے کنارے ایک لمبا چکر لگاتی ہیں اور پھر اپنے چھوٹے سے گھر میں لوٹ جاتی ہیں جسے انہوں نے اس طرح سجایا ہے کہ رام پور کی کسی محل سرا کی یاد دلا تا ہے۔ قدیم وضع کے دیوان اور کرسیاں، فرش پر قالین اور جاذم، دیواروں پر پینٹنگز جن میں بیشتر ان کی بیٹی سیما کی بنائی ہوئی ہیں جو ایک اچھی پینٹر ہے۔ ان کے گھر جب بھی جاؤں تو ایک عجیب باوقار خاموشی کا احساس ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے یہ وہی خاموشی اور سکون ہے، جو شمع کے اندر ہے۔

کبھی کبھی جب ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے کچھ سوچتے ہوتے ہیں تو میں ان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھ لیتا ہوں اور مجھے ایک ایسی شمع زیدی دکھائی دیتی ہیں جو برسوں سے پیپل کے ایک پیڑ تلے آنکھیں بند کیے بیٹھی ہیں اور انتظار کر رہی ہیں اس موکش کا جس کے بعد انسان کے سارے دکھ ختم ہو جائیں گے۔ کسان خودکشی نہیں کریں گے۔ عورتیں کھلونا نہیں ہوں گی۔ انتہا پسندی کو مذہب نہیں کہا جائے گا۔ ایٹمی ہتھیار سمندروں میں دفن ہو چکے ہوں گے۔ اردو کو اس کا حق مل چکا ہو گا۔

فہرست لمبی ہے، عمر کم ہے۔ پتہ نہیں شمع کو نروان ملے گا یا نہیں۔؟ مگر گوتم بدھ کو بھی کہاں معلوم تھا کہ جب وہ آنکھ کھولیں گے تو شراوتی کے جنگلوں میں پھول کھل چکے ہوں گے اور نئی فصل آچکی ہو گی!

☆☆☆

اکبری بوا

گیلے کپڑے سے ڈھکی ہوئی ایک بڑی سی ٹوکری سر پر اٹھائے ودیا ساگری جوتی کھٹ کھٹاتی اکبری بوا نے جیسے ہی آنگن میں قدم رکھا تو گھر کی ساری ہلچل رک گئی...... دوڑتے بھاگتے شور مچاتے بچوں نے بوا کو دیکھا تو کھیلنا چھوڑ دیا اور ان کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ فیاضی بیگم نے حقے کی منہ نال ہونٹوں سے ہٹا کر خوشبودار دھواں چھوڑا اور مسکرائیں۔ باجی باورچی خانے میں تھیں، وہیں سے جھانک کر دیکھا اور چلائیں: ''ارے اکبری بوا آئی ہیں......'' کمروں دالانوں سے کئی آپائیں اور باجیاں باہر نکل آئیں۔ بوا نے چبوترے پہ اپنی ٹوکری رکھی، کمر پہ ہاتھ رکھ کر سیدھی ہوئیں، کالے رنگ کی میلی اوڑھنی سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور بولیں:

''بی بی سلام''

فیاضی بیگم نے سر ہلایا: ''سلام، کیسی ہو؟''

''آپ کی دعا، مالک کی مہربانی۔ ہاتھ پاؤں چل رہے ہیں، کسی کی قرض دار محتاج نہیں ہوں، پیالی بناؤں؟......''

''میں تو نہیں کھاؤں گی، بچوں کو کھلا دے......''

فیاضی بیگم نے کہا اور پھر اپنے حقے میں مصروف ہوگئیں۔ بچوں کو اتنا اشارہ کافی تھا، انھوں نے بوا کو گھیر لیا اور فرمائشیں شروع ہوگئیں۔ باجی کی آواز باورچی خانے سے سنائی دی:

"بوا میرے لیے ادھر ہی بھیج دینا، مرچیں کم ڈالیو......"

بوا نے ایک پیڑھی گھسیٹی اور اپنی ٹوکری کے پاس بیٹھ گئیں۔ انھوں نے کسی جادوگر کی طرح ٹوکری پہ ڈھکا ہوا گیلا کپڑا ہٹادیا۔ بوا کی ٹوکری کے بیچ میں ایک بڑی سی مٹکی ہوتی تھی جس میں دہی بھرا ہوتا تھا۔ ایک دوسری چھوٹی مٹکی میں بیسن کی پھلکیاں رکھی رہتی تھیں۔ مٹکی کے چاروں طرف بڑے سلیقے سے مٹی چینی کی چھوٹی بڑی پیالیاں، مسالوں کے ڈبے اور چمچے سجے ہوتے تھے۔ بوا ایک پیالی اٹھاتیں، اسے سوکھے کپڑے سے رگڑ کر صاف کرتیں، پھلکیوں والی مٹکی سے کچھ پھلکیاں نکالتیں اور انھیں پیالے میں رکھ کے ہاتھ سے توڑ دیتیں۔ پھر باری باری سے نمک، موٹی موٹی کٹی ہوئی لال مرچ، گرم مسالہ اور چاٹ مسالہ ڈال کر چمچے سے مکس کرتی۔ پھر اتنا دہی ڈالتیں کہ پیالی بھر جاتی۔ دہی کے اوپر ہرے دھنیے کی چار چھ پتیاں رکھتیں اور پسا بھونا، زیرا اس طرح چھڑکتیں جیسے پیالی کو نظر کا ٹیکا لگا رہی ہوں۔ آخری کام ہوتا پیالی میں ایک چمچہ ڈالنا اور کسی پھیلے ہوئے ہاتھ پہ رکھ دینا۔ ٹوکری پر رکھے ہوئے گیلے کپڑے کا راز بتانا بھی ضروری ہے۔ اسے گیلا اس لیے کیا جاتا تھا کہ مٹکی ٹھنڈی رہے اور کپڑا ہوا سے اڑ نہ جائے۔

اکبری بوا کی دہی پھلکیاں دور دور تک مشہور تھیں مگر گھروں کے اندر......

انھوں نے کبھی سڑک پر اپنا خوانچہ نہیں سجایا۔ نہ ہی اپنی ٹوکری لے کے میلے ٹھیلے میں گئیں۔ ایک گھر سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں گھومتی رہتی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایسی لذت تھی کہ جہاں جاتیں تھیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں۔ ریاست کے شاہی رکاب دار بھی بوا کی پھلکیاں کھا کے پیالی اور انگلیاں دونوں چاٹ لیا کرتے تھے۔ یہی حال ان کے سیخ کباب کا بھی تھا۔ جب سردیاں آتیں اور بہت سے لوگ دہی کا نام سنتے ہی چھینکنے کھانسنے لگتے تو بوا پھلکیوں کی جگہ گرم گرم سیخ کباب ٹوکری میں لے کے نکلتیں اور اکثر ایسا ہوتا کہ سارے کباب ایک دو گھروں میں ہی ٹھکانے لگ جاتے۔ اس لیے بوا نے ایک اصول بنالیا تھا کہ کسی ایک گھر میں مہینے میں چار دفعہ سے زیادہ نہیں جاتی تھیں۔ بوا کسی باورچی کی اولاد نہیں تھی۔ کباب اور پھلکیاں بنانا اور بیچنا ان کا خاندانی پیشہ بھی نہیں تھا۔ بقول بوا کے:

"یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں بھیا، کہانی شروع کہاں سے ہوتی ہے اور
کہاں جا کے ختم ہوتی ہے۔"

اکبری بوا اصل نسل کی ترک تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ مغربی یوپی میں جو لوگ ترک کہلاتے ہیں ان کے پرکھے ترکی سے آئے تھے اور یہاں رس بس گئے تھے، اب یہ لوگ تُرک (بروزن "سلگ") کہلاتے ہیں۔ لمبا قد، بھرا ہوا بدن، اونچی ناک، بڑی بڑی آنکھیں اور موٹے مگر چھوٹے ہونٹ، جب میں نے انھیں دیکھا تھا تو بال سفید ہو چکے تھے، رنگ جو کبھی گورا رہا ہوگا سانولا ہو چکا تھا اور ہاتھوں پہ جھریاں پڑ چکی تھیں۔ ڈھیلا کرتا اور آڑا پائجامہ پہنتی تھیں۔ اوڑھنی ہمیشہ کالی ہوتی تھی۔ ہاتھوں میں کانچ کی دو دو چوڑیاں پڑی رہتی تھیں اور کان میں چاندی کی بالیاں۔ میں جب بھی انھیں یاد کرتا ہوں سب سے پہلے گلے میں پڑا ہوا بڑا سا چاندی کا چوکور تعویذ یاد آتا ہے، جس پر سفید پتھر کا چاند جڑا ہوا تھا جو دھوپ میں دور سے چمکتا تھا۔

شہر سے باہر اس علاقے میں جو اب بھی "پکا باغ" کہلاتا ہے، املی اور نیم کے پیڑوں سے گھرا ہوا محمد احمد کا طویلہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں دس پندرہ بھینسیں دودھ دینے اور جگالی کرنے میں لگی رہتی تھیں۔ محمد احمد کے باپ دادا کھیتی باڑی کرتے تھے مگر پتا نہیں کیا سوجھی کہ محمد احمد نے ہل چلانے والے بیلوں کو خدا حافظ کہا اور بھینسیں پال کر دودھ کا کاروبار کرنے لگا۔ وہ بڑا نیک اور ایمان دار آدمی تھا۔ جمعے کی نماز اور نماز کے بعد شاہ بغدادی کی درگاہ پر حاضری دینا کبھی نہیں بھولتا تھا۔ دودھ میں پانی ملانے کو حرام سمجھتا تھا۔ اگر کبھی بیماری کی وجہ سے کسی بھینس کا دودھ پتلا ہو جاتا تو غریبوں میں بانٹ دیا کرتا تھا۔ مگر اپنے خریداروں کو دھوکا نہیں دیتا تھا۔ ہر ایک بھینس کو سامنے کھڑے ہو کے دھلواتا، سرسوں کے تیل کی مالش کرواتا۔ یہاں تک کہ بھینسوں کی کالی کھال سنگ موسیٰ کی طرح چمکنے لگتی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنا نمازی پرہیزگار مسلمان اپنی بھینسوں کے نام ہندو دیویوں کے نام پر رکھتا تھا۔ اس کے طویلے میں لکشمی، سرسوتی، گنگا، رادھا، سیتا اور پاروتی سبھی موجود تھیں۔ بوا بتاتی تھیں ایک مولانا نے ٹوکا بھی تھا:

"اما کیسے آدمی ہو، اتنے پکے مسلمان ہو اور کافروں کے نام رکھتے ہو؟" اور

یہ بھی سنا ہے کہ محمد احمد نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا تھا: "ارے مولبی صاب جانور نہ ہندو نہ مسلمان، اس سے کیا فرق پڑتا ہے اور ہمارے لیے نام ایک پہچان ہے۔ تو ہمیں بھی کیا فرق پڑتا ہے"...... مجھے یقین ہے مولانا اس عالمانہ دلیل پر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے ہوں گے۔ یہ سب قصے اکبری بوا پیالی بناتے بناتے مزے لے لے کر سنایا کرتی تھیں اور سننے والے ڈبل مزالیا کرتے تھے پیالی کا بھی اور قصے کا بھی......

محمد احمد کا تھوڑا اسا ذکر اور سن لیجیے۔ اللہ نے اور تو سب کچھ دیا ہی تھا، دو خوبصورت بیٹیاں بھی دی تھیں۔ بیٹے کا بڑا ارمان تھا۔ کہا کرتا تھا: "اگر بیٹا ہوا تو حج کو جائے گا۔" مگر افسوس بے چارے کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ بیوی اس کا ارمان پورا کیے بغیر ہی چل بسی۔ تب لوگوں نے سمجھایا کہ داماد بھی تو بیٹے جیسے ہوتے ہیں۔ بیٹیوں کی شادی کرادو، بیٹے کی کمی پوری ہو جائے گی۔

چناں چہ بڑی بیٹی افسری کا رشتہ چندوسی میں ڈھونڈ اگیا۔ لڑکا پڑھا لکھا تھا، مکان دو منزلہ تھا اور چالیس بیگھ میں کھیتی ہوتی تھی۔ بیٹی بہت خوش تھی مگر دور چلی گئی تھی۔ اس لیے محمد احمد نے فیصلہ کیا کہ اکبری کی شادی اپنے ہی شہر میں کرے گا۔ ترکوں کی برادری کافی بڑی تھی مگر اتنی بڑی بھی نہیں تھی کہ جیسا لڑکا محمد احمد کو چاہیے تھا ویسا آسانی سے مل جاتا۔ گھوم پھر کر نظر ایک دور کے رشتے دار الطاف پہ ٹھہری۔ لڑکا نیک تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ وہ بھی دودھ کا کاروبار کرتا تھا مگر طویلے میں چار ہی جانور تھے، ان سے جو مل جاتا تھا وہی کل آمدنی تھی۔ ایک اچھی بات اور بھی تھی کہ بالکل اکیلا تھا۔ ماں باپ مر چکے تھے، کوئی بہن بھائی بھی نہیں تھا۔ اس لیے اکبری کو ساس نندوں کے نخرے بھی نہیں اٹھانے پڑتے۔ یہی سوچ کر محمد احمد نے الطاف کو بلایا اور اس پر اپنا ارادہ ظاہر کیا تو وہ جھٹ راضی ہو گیا۔ ہونا بھی چاہیے تھا۔ ایک تو اکبری خوبصورت، اوپر سے امیر باپ کی بیٹی۔ الطاف کی امید یہ بھی تھی کہ ایک نہ ایک دن تو محمد احمد کا سب کچھ اسی کو ملے گا۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی، محمد احمد نے بیٹی کو وہ سب کچھ دیا جو دے سکتا تھا۔

زیور، کپڑے، برتن، بھانڈے تو دیے ہی دیے، گنگا اور لکشمی جیسی دودھاری بھینسیں بھی جہیز میں دیں۔

الطاف نے تو سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن چھپر پھٹے گا اور اس کا اجاڑ گھر یوں بھر جائے گا۔ اس نے اکبری کی ناز برداری میں کوئی کمی نہیں کی مگر جلدی ہی دونوں کو معلوم ہو گیا کہ ان کی عادتیں، مزاج اور سوچ ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ایک پورب ہے تو دوسرا پچھم، ایک آم ہے تو دوسرا املی۔ اکبری اور الطاف کا پہلا جھگڑا شادی کے چودھویں دن ہوا۔

صبح کا وقت تھا۔ الطاف دکانوں مکانوں پر دودھ بھجوا کر ناشتہ کرنے بیٹھا۔ اکبری نے جھاگ جیسا سفید تازہ مکھن گرم پراٹھوں پر رکھا اور تانبے کے لاہوری گلاس کو دودھ سے بھر دیا۔ الطاف نے ناشتہ کرتے کرتے اپنے طویلے کی طرف دیکھا اور بولا: ''میں نے تیری دونوں بھینسوں کے نام سوچ لیے ہیں۔''

اکبری ہنس پڑی:

''اے لو، تمھیں اتنا بھی نہیں معلوم ان کے نام تو پہلے سے ہیں، گنگا، لکشمی......''

الطاف نے منہ کا نوالہ دودھ سے نیچے اتارا اور بولا:

''یہ ہندوؤں کے نام ہیں، میرے گھر میں نہیں چلیں گے۔ آج سے ان کے نام ہوں گے لیلا اور منی''

اکبری کو غصہ تو بہت آیا مگر پی گئی۔ بس اتنا کہا:

''ابا نے رکھے ہیں، بنیں گے تو اچھا نہیں لگے گا۔''

''نہیں لگے گا تو نہیں لگے، اب یہ میری چیز ہے جو جی چاہے کروں''

ناشتہ کر کے الطاف دکان پہ گیا تو اکبری سے رہا نہ گیا۔ وہ سیدھی اپنی بھینسوں کے پاس پہنچی۔ گنگا جگالی کر رہی تھی، لکشمی اس کے پاس چپ چاپ کھڑی تھی۔ دونوں نے جیسے اکبری کو

دیکھا تو زور زور سے سر ہلانے لگیں۔ لکشمی نے منہ سے ہلکی سی آواز بھی نکالی جیسے شکایت کر رہی ہو:

''ہمارے پاس آنے کی فرصت مل گئی تم کو......؟''

اکبری نے لکشمی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ماتھا چوم لیا۔ اس نے گنگا کے ہونٹوں پر لگا جگالی کا جھاگ مہندی بھری ہتھیلی سے پونچھا اور اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر بڑے پیار سے بولی:

''میری گنگا میری لکشمی......'' لکشمی نے اپنی بڑی بڑی کاجل بھری آنکھوں سے اکبری کو دیکھا، سر کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ گنگا بھی اپنی لمبی لمبی پلکیں جھپکا رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو:

''کسی کو کچھ بھی بولنے دو، ہم تو وہی ہیں جو تھیں......گنگا اور لکشمی......''

رات کو الطاف آیا تو اکبری نے اونچی آواز میں کہا:

''سنو جی، بھینسوں کے نام نہیں بدلے جائیں گے''......

الطاف چونک پڑا، نئی دلہن کے یہ تیور اس کے لیے نئے تھے:

''اچھا؟ کیوں؟'' الطاف کی آواز بھی کافی اونچی تھی۔

''یہ جانور میرے ہیں، میں جہیز میں لے کر آئی ہوں، تم نے خریدے نہیں ہیں۔''

الطاف کھڑا ہو گیا:

''بڑی اترا رہی ہے اپنے جہیز پہ، چار جوڑے کپڑے اور بڑھیا بھینسوں کو جہیز بولتی ہے تو......ارے کوئی گاؤں، جاگیر لکھوا کر لاتی تو ایک بات بھی تھی......''

''میری جاگیر یہ جانور ہیں، وہ لے کر آئی ہوں اور کون سی جاگیر چاہیے تھی تمھیں......''

جھگڑا دیر تک چلتا رہا اور اس وقت ختم ہوا جب الطاف نے اکبری کے باپ کو گالی دی اور اکبری رونے لگی۔ الطاف نے کھاٹ اٹھائی اور سونے کے لیے باہر چلا گیا۔ اکبری رات بھر روتی رہی۔

شروع شروع میں یہ جھگڑے بڑے ڈراونے لگتے تھے۔ جب بھی الطاف سے لڑائی ہوتی، اکبری سوچتی:

"مولا اس آدمی کے ساتھ ساری عمر کیسے کٹے گی"

مگر عمر کٹتی رہی اور پانچ برس گزر گئے اور جھگڑوں نے ایک نیا رخ لے لیا۔

الطاف اٹھتے بیٹھتے طعنے دینے لگا تھا کہ

"افسری چار بچوں کی ماں بن چکی ہے اور اکبری نے چوہے کا بچہ بھی نہیں جنا ہے......"

ایسا نہیں تھا کہ اکبری کو ماں بننے کا ارمان نہیں تھا یا اس کی چھاتیاں درد نہیں کرتی تھیں۔ مگر وہ کرتی بھی تو کیا کرتی۔ بڑے اسپتال کی ڈاکٹرنی نے کہا تھا:

"تم میں کوئی خرابی نہیں ہے بچہ ہونا چاہیے"

وید جی کا کاڑھا پیا، حکیم جی کی جوارش چاٹی۔ مگر پیٹ میں کوئی ہلچل نہیں ہوئی۔ اکبری کے کہنے پر الطاف نے بھی اپنا ٹیسٹ کرایا، اس کی رپورٹ بھی نارمل تھی۔ تو اب کیا کہا جا سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ اللہ کی یہی مرضی تھی۔ مگر الطاف اللہ کی مرضی کے آگے سر جھکانے کو تیار نہیں تھا۔ وہ خود اپنے گھر کی اکیلی اولاد تھا۔ بھائی بہن عزیز رشتے دار کوئی نہ تھا اس لیے اس کی خواہش تھی اس گھر کو ایک وارث تو ملنا ہی چاہیے۔ اس کی یہ آرزو جنون کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

جب سات برس گزر گئے اور خالی گود خالی ہی رہی تو اکبری نے ایک فیصلہ کیا اور الطاف سے کہا:

"میں تمہارا دوسرا بیاہ کراؤں گی اور ایسی دلہن لے کر آؤں گی جو سال بھر کے اندر ہی اس گھر کے اندھیرے میں دیا جلا دے گی۔"

اکبری کا دل رکھنے کے لیے الطاف نے اسے بہت روکا مگر اکبری اس مسکراہٹ کو دیکھ چکی تھی جو نئی بیوی اور بچے کے تصور سے الطاف کے ہونٹوں پہ پھیل گئی تھی۔

اکبری نے چھ مہینے میں کوئی درجن بھر لڑکیاں دیکھ ڈالیں مگر ایک بھی پسند نہیں آئی۔ وہ ایک ایسی لڑکی ڈھونڈ رہی تھی جو الطاف کے گھر میں اس کی اپنی کمی کو پورا کردے۔ سچ پوچھیے تو وہ خود کو ڈھونڈ رہی تھی اور خود کو ڈھونڈنا آسان نہیں ہوتا۔

رمضان کا چاند دکھائی دیا تو اکبری چاند مبارک کہنے کے لیے باپ کے گھر آئی۔ ہمیشہ کی طرح طویلے میں کام کرنے والے سبھی لوگ آ کر ملے۔ ان میں وشوا گھوسی بھی تھا۔ وشوا اور محمد احمد بچپن کے ساتھی تھے۔ کہنے کو محمد احمد مالک اور وشوا نوکر تھا مگر اکبری، افسری اس کو وہی عزت دیتی تھیں جو ایک لاڈ پیار کرنے والے چاچا کو دی جا سکتی ہے۔

وشوا اکبری کا ہاتھ پکڑ کے کونے میں لے گیا اور دھیرے سے بولا:

"سنا ہے تو الطاف کا دوسرا بیاہ کرا رہی ہے؟"

اکبری نے ٹھنڈی سانس لی اور مسکرا دی:

"تمھیں تو سب معلوم ہے چاچا، بانجھ کے سر پہ سوت نہیں آئے گی تو کون آئے گا؟" وشوا سر جھکا کے کچھ سوچتا رہا پھر بولا: "رمضانی کی بیٹی حسینہ کو دیکھا ہے تو نے؟"

رمضانی بھی وہیں طویلے میں کام کرتا تھا اور وہ بھی وشوا کی طرح پرانا آدمی تھا۔ اس کی پانچ بیٹیاں تھیں، سب سے بڑی حسینہ تھی۔

اکبری نے اور کچھ نہیں سنا، بس ٹھیلا منگایا اور رمضانی کے گھر پہنچ گئی۔ حسینہ کی وہی عمر تھی جس میں اکبری کی شادی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں وہی مستی اور خواب تھے جو آٹھ برس پہلے اکبری کی آنکھوں میں ہوا کرتے تھے۔

رمضانی کا کام تھا بھینسوں کی مالش کرنا اور ان کو چرانے نہلانے کے لیے تالاب پر لے جانا۔ تنخواہ کے علاوہ آمدنی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اور کھانے والے تھے سات۔ ظاہر ہے کہ مفلسی در و دیوار سے ٹپک رہی تھی، مگر اکبری نے کچھ بھی نہیں دیکھا بس حسینہ کو دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی...... یہ جوانی بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔ گھر بار، حال احوال، پیسہ، پیشہ کچھ نہیں دیکھتی۔

بسنت رت کی طرح چپکے سے آجاتی ہے اور ویرانوں میں بھی پھول کھلا دیتی ہے۔گدڑی میں لعل کی کہاوت سنی تھی مگر حسینہ اس کی زندہ مثال تھی۔

اکبری کی بات سن کر رمضانی پریشان ہوگیا۔عمر میں دگنے کا فرق تھا۔حسینہ اٹھارہ کی تھی الطاف چھتیس کا۔پھر یہ کہ شادی شدہ تھا مگر جب اکبری نے اس کے سامنے پلو پھیلایا تو وہ انکار نہیں کرسکا۔اکبری کے باپ کے بہت احسان تھے اس پہ اور الطاف کا شمار کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا تھا۔اپنا کاروبار تھا، مکان تھا، دکان تھی اور کیا چاہیے۔اب رہ گئی بات عمر کی تو حسینہ سے بڑا تھا، مگر تھا تو جوان......

رمضانی کی ہاں سننے کے بعد اکبری نے وہ کیا جو بیٹیوں کی شادی میں مائیں بھی نہیں کرتی ہیں۔اس نے حسینہ کے سارے جوڑے اپنے ہاتھ سے سیے۔شادی کا کارچوبی گھاگھرا بنوانے کے لیے مرادآباد تک دوڑی چلی گئی۔ڈھولک پیٹ پیٹ کر اتنے سہاگ گائے کہ آواز بیٹھ گئی۔ساری برادری کو نیوتا دیا۔باراتیوں کی اڑد چاول اور اصلی گھی کے زردے سے تواضع کی گئی۔اور جب الطاف اپنی نئی دلہن کو لے کر کوٹھری میں گیا تو اکبری سجدے میں گر پڑی:

''مالک اب میری بات کی عزت تیرے ہاتھ ہے......''۔

لوگ کہتے ہیں اکبری نے اپنی سوت کو وہ جگہ دی جو کسی بہن، بیٹی کو بھی نہیں ملتی۔اس نے حسینہ کو ہل کر پانی بھی نہیں پینے دیا۔اور پھر جب دس مہینے بعد ایک دن حسینہ کو ابکائی آئی تو اکبری کے منہ سے چھینک نکل گئی۔وہ دودھ کی بالٹی چھوڑ کر بھاگی اور حسینہ سے لپٹ گئی۔اور جب حسینہ نے شرماتے شرماتے سر ہلایا تو اکبری جیسے پاگل ہوگئی۔اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنی اوڑھنی پکڑی اور آنگن میں ناچنا شروع کردیا۔اس کی پھٹی ہوئی آواز میں زچہ گیری سن کے حسینہ ہنستے ہنستے دوہری ہوگئی:

پچھواڑے بیٹھ کے سونٹھ کھائی
منہ پونچھن گھر کو آئی
موری زچہ بڑی ہوسیار

ہورا ماموری زچہ بڑی ہوسیار......

اکبری نے حسینہ کو پہلے ہی چھوئی موئی بنا رکھا تھا۔ پاؤں بھاری ہوا تو پلنگ پر ہی قید کر دیا۔حد یہ ہے کہ اس کے ہاتھ بھی اپنے ہاتھ سے دھلواتی تھی۔ ساتویں مہینے گود بھرائی کی رسم کی تو محلے بھر میں مٹھائی بانٹی۔ سب کو کھانا کھلایا، دودھ دوہنے والے سے لے کر گوبر اٹھانے والے تک سب کو جوڑے دیے اور حسینہ کو سونے کا وہ جھومر دے دیا جو اپنے میکے سے لے کر آئی تھی۔

اکبری کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے اس کے پیروں میں پر لگ گئے ہوں۔ فجر کی نماز پڑھ کر جو کھڑی ہوتی تو اس وقت تک کام کرتی رہتی جب تک جوڑ جوڑ پکے ہوئے پھوڑے کی طرح درد نہ کرنے لگتا۔ دوسرے دن پھر وہی......

اس کے جوش کو دیکھ کے الطاف ہنستا تھا:

''اپنی خدمت کے بدلے تو کیا لے گی؟''

''ایک بیٹا'' اکبری تڑ سے جواب دیتی۔ پھر وہ دن بھی آیا جب بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اکبری قرآن پاک سینے سے لگائے کوٹھری کے باہر کھڑی تھی۔ آواز سنتے ہی بلک بلک کے خود بھی رونے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے آٹھ برس کے رکے ہوئے آنسو ایک ساتھ بہہ جائیں گے۔ رام پیاری دائی نے بچے کو صاف کر کے کپڑے میں لپیٹا اور اکبری کی گود میں رکھا تو اکبری کی آنسو بھری آنکھوں میں ایسی چمک آئی جیسے بارش کے بیچ میں دھوپ نکل آئے۔

برسوں کی سوکھی ہوئی چھاتیاں اچانک درد سے پھٹنے لگیں۔ اسے ایسا لگا جیسے انگیا دودھ سے گیلی ہو گئی ہو۔ اس نے بچے کو الطاف کی گود میں ڈالا اور بھاگتی ہوئی گھر سے نکل گئی۔ پورے چار دن تک شہر کی ہر درگاہ، ہر مزار اور ہر مندر کے چکر کاٹتی پھری۔ کہیں چادر چڑھائی، کہیں چڑھاوا دیا، کہیں اگربتی سلگائی اور ان سب کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے اتنی منتوں اور مرادوں کے بعد اس کی گود بھر دی تھی۔ عقیقہ کیا تو آٹھ بکرے کاٹے اور گیارہ کالی مرغیوں کا صدقہ اتارا۔ الطاف

کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا، اس نے اکبری کو ٹوکا:

"ارے تو پاگل ہوگئی ہے، دونوں ہاتھ سے خرچہ کیے جا رہی ہے، گھر لٹائے گی کیا؟"

اکبری زور سے ہنسی:

"گھر بھرنے والا جو آگیا ہے......"

اکبری نے بچے کا نام "اللہ دیا" رکھا جو حسینہ کو بالکل پسند نہیں آیا:

"یہ کوئی نام ہوا، میں تو اپنے بچے کا نام منظور رکھوں گی۔"

اکبری کو برا تو لگا مگر چپ رہی۔ کیوں کہ حسینہ کا حق زیادہ تھا۔

ایک دودھ پلانے کو چھوڑ کے بچے کا ایسا کوئی کام نہیں تھا جو اکبری نہ کرتی ہو۔ اس نے اپنی کھاٹ کوٹھری کے باہر ہی ڈال دی تھی۔ رات کو بچہ چوں بھی کرتا تو اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ منظور بھی جواب پیار سے منجو کہلانے لگا تھا شاید پہچان گیا تھا کہ پیٹ بھلے ہی حسینہ کا ہو مگر ماں تو اکبری ہی ہے۔ بندریا کے بچے کی طرح ہر وقت اکبری کی چھاتی سے چپکا رہتا تھا۔ اور وہ اللہ کی بندی بھی اپنے سارے کام منجو کو گود سے اتارے بنا کیا کرتی تھی۔ دودھ دوہنا ہو، کھلی توڑنا ہو، سانی بنانا ہو یا کھانا پکانا ہو، منجو تعویذ کی طرح اس کی گردن سے لٹکا رہتا۔ جب تک بچے کو پالنے اور سنبھالنے کی ضرورت تھی تب تک حسینہ نے کچھ نہیں کہا۔ مگر جیسے ہی وہ قدم دو قدم چلنے لگا اور اپنی توتلی زبان سے اماں ابا بولنے لگا تو حسینہ نے الطاف سے شکایت کی:

"آپا اپنے لاڈ پیار میں بچے کو خراب کر رہی ہیں، میری تو وہ سنتا ہی نہیں ہے، جب دیکھو ان کے پاس گھسا رہتا ہے۔ میں گود میں لیتی ہوں تو چیخیں مارنے لگتا ہے۔ جیسے میں ماں نہیں سوتیلی ماں ہوں......"

"کیسی باتیں کرتی ہے تو؟"

الطاف نے اسے ہنس کے ڈانٹ دیا۔

"معصوم بچہ سگا سوتیلا کیا جانے، منجو بڑا ہوگا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

منجو بڑا ہوتا گیا اور اس کو لے کر دونوں ماؤں کے جھگڑے بھی بڑے ہوتے گئے۔ ایک دن تو حد ہو گئی۔ حسینہ کہیں سے مٹھائی لے کر آئی اور منجو کو کھلانے لگی۔ مگر اس نے برا سا منہ بنا کے تھوک دی۔ حسینہ کو غصہ آگیا، اس نے منجو کو زوردار تھپڑ لگایا اور گالیاں دینے لگی:

''حرام کے جنے، سور کی اولاد، آپا سے بھینسوں کو کھلانے والا گڑ مانگ مانگ کے کھاتا ہے اور میں اتنی اچھی مٹھائی دے رہی ہوں تو تھوک رہا ہے کمینہ''۔

بچہ بلک کے رونے لگا۔ اکبری نے منجو کے رونے کی آواز سنی تو روٹی توے پہ چھوڑ کر بھاگی:

''کیا ہوا، ارے کیا ہوا، رو کیوں رہا ہے میرا بچہ؟''

''میں نے مارا ہے، اور بھی ماروں گی''۔

اکبری کو اپنی آنکھوں اور کانوں پہ یقین نہیں آیا۔ اس نے حسینہ کے یہ تیور پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے اور نہ ہی اس طرح کی بات سنی تھی:

''مگر ہوا کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''سب تمہاری للو پتو کا نتیجہ ہے، اتنا ضدی بنا دیا ہے حرامی پلے کو کہ بات ہی نہیں سنتا''۔

''کیا نہیں سنا اس نے؟''

''مٹھائی لائی تھی۔ منہ میں رکھتے ہی تھوک دی، جیسے میں زہر دے رہی تھی حرامی کو......''

اکبری نے اپنی اوڑھنی سے منجو کی آنکھیں اور ناک پونچھی اور دھیرے سے بولی:

''معصوم بچہ ہے دلہن، اچھی اور بری چیز کی پہچان نہیں ہے۔ کہاں ہے مٹھائی لاؤ میں کھلاؤں......''

اکبری نے جیسے ہی مٹھائی کے دونے کی طرف ہاتھ بڑھایا، حسینہ نے اس کا ہاتھ جھٹک

دیا:

"نہیں، آج کے بعد سے یہ جو کچھ بھی کھائے گا میرے ہاتھ سے کھائے گا، نہیں تو بھوکا ماردوں گی کتے کو......"

اکبری نے بڑی حیرت سے حسینہ کو دیکھا پھر بچے کو دیکھا جواب تک سسکیاں لے رہا تھا اور بہت دیر تک کچھ سوچتی رہی:

"تو ٹھیک کہتی ہے دلہن، مگر یہ کام اتنی آسانی سے نہیں ہونے کا ہے۔ تجھے ماں بننا ہے تو پہلے اپنی مامتا دکھا پھر اس سے اپنا حق مانگیو"

"یہ سب باتیں رہنے دو۔"

حسینہ چمک کر بولی۔

"تم ماں بننا بند کرو تو یہ اپنی ماں کو ماں سمجھے گا۔"

اکبری کی آنکھوں میں آنسو آجانے چاہیے تھے مگر وہ مسکرادی۔ اس نے منجو کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کوٹھری سے باہر نکل گئی۔

توے پہ رکھی روٹی جل کر راکھ ہو چکی تھی اور دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کے بعد اکبری نے بہت کوشش کی کہ منجو اس سے دور ہو جائے۔ وہ جھڑکتی تھی، ڈانٹتی تھی، بار بار بھگا دیتی تھی مگر منجو تو جیسے اس کی اوڑھنی کے پلو سے بندھ گیا تھا، وہ اسے کہاں چھوڑنے والا تھا۔ پیڑ کی چھال کی طرح چپکا ہی رہتا تھا اور حسینہ دیکھ کے سلگتی رہتی۔

آئے دن کی دانتا کل کل سے الطاف بھی پریشان ہو چکا تھا۔ حسینہ نے نوٹس دے دیا تھا کہ اگر اس نے اکبری کو گھر سے نہیں نکالا تو وہ خود کہیں چلی جائے گی۔ مگر الطاف اکبری کو کیسے نکال سکتا تھا، طویلہ تو اسی کے دم سے چل رہا تھا۔ ایک رات جب وہ گھر آیا تو گھر میں کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ پتا چلا کہ حسینہ اور اکبری میں پھر جھگڑا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اکبری اپنے باپ کے گھر چلی گئی ہے۔ اور حسینہ نے جو کچا پکا سامنے رکھا وہ کھانے کے لائق نہیں تھا۔ ایک تو غصہ اوپر سے بھوک، الطاف نے حسینہ کو اتنا مارا کہ اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں اور بدن پہ نیل پڑ گئے۔

الطاف اکبری کو منا کے لے آیا مگر گھر میں چولہے الگ ہو گئے۔ حسینہ اور اکبری ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کرتی تھیں۔ منجو کو پڑھانے کے لیے ایک ملا آنے لگا تھا۔ وہ ملا پشاور سے مدرسہ عالیہ میں پڑھنے کے لیے آیا تھا، اس محلے کی مسجد میں امامت کرتا تھا اور رہتا بھی وہیں تھا۔ اکبری اس ملا کو رات کا کھانا اور دو روپیہ مہینے دے دیا کرتی تھی۔

محمد احمد نے اللہ سے دعا کی تھی کہ بیٹا ہو گا تو حج کو جائے گا، بیٹا نہیں ہوا تو دعا بدل گئی۔ اللہ بیٹیوں کا گھر بسا دے اور اچھے داماد دلا دے تو جائے گا۔ اور اب جب کہ اس کی ساری آرزوئیں پوری ہو چکی تھیں تو اس نے حج کی نیت باندھ ہی لی۔ جتنے جانور رہ گئے تھے ان کو بیچ ڈالا، گھر بند کیا اور اللہ کی راہ میں چل پڑا۔ جس زمانے میں محمد احمد جانے کی تیاری میں لگا ہوا تھا، افسری اور اکبری دونوں اس کے پاس آ گئی تھیں۔ اکبری باپ کو ٹرین پہ چڑھانے کے لیے اسٹیشن تک گئی، افسری بھی اسی ٹرین سے اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔ اکبری آنسو پونچھتی بھاری دل سے گھر پہنچی تو سہم کر دروازے ہی میں کھڑی رہ گئی۔ کوٹھری میں حسینہ اور منجو کے ملاجی میں کچھ چھینا جھپٹی ہو رہی تھی۔ اور دونوں زور زور سے ہنس رہے تھے۔ اکبری کو پسینہ آ گیا، وہ گھبرا کے باہر نکل گئی اور اس وقت تک گلی میں گھومتی رہی جب تک ملا مسجد کو نہیں چلا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ دل کہتا تھا کہ الطاف کو بتا دے مگر دماغ سمجھاتا تھا کہ اگر کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو بدنامی اپنے ہی گھر کی ہو گی۔

ایک دن اکیلے میں اکبری نے حسینہ کو سمجھایا کہ نادان لڑکی جو کچھ تو کر رہی ہے وہ آگ سے کھیلنے کے برابر ہے، ابھی یہ بات کسی اور کو نہیں معلوم ہے مگر ایسی باتوں کو چوکھٹ پار کرتے دیر نہیں لگتی۔ اور خدانخواستہ ایسا ہوا تو الطاف تجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ناک، کان تو کاٹ ہی لے گا۔ حسینہ نے قرآن اٹھا لیا۔ اس نے کہا:

> ”شہد کی مکھی گھس آئی تھی، ملاجی اسے بھگا رہے تھے، کوئی مستی مذاق نہیں کر رہے تھے۔“

اکبری کا جی چاہا کہ جھوٹی کا گلا گھونٹ دے مگر قرآن کی قسم کو جھٹلا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس

لیے خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئی اور صرف اتنا کہا:

"ہو سکتا ہے میں نے غلط دیکھا ہو۔"

حسینہ اب اتنی اناڑی بھی نہیں تھی کہ اکبری کے تیور اور حالات کا رخ نہ پہچان سکے۔ اس نے ملا کا آنا تو بند کرا دیا مگر اکبری اس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھنے لگی۔ اور اس نے فیصلہ کیا کہ اگر اس کانٹے کو ہمیشہ کے لیے نہیں نکالا گیا تو وہ کبھی سکھ سے نہیں رہ سکے گی۔

رجب کا مہینہ آیا۔ حسینہ نے کونڈوں کی نیاز رکھی مگر زیادہ لوگوں کو نہیں بلایا بس گھر والے تھے اور کچھ پڑوسی۔ رات کو جب اکبری نے نیاز کے خالی کونڈے تالاب میں ٹھنڈے کرنے کے لیے اٹھائے تو اسے چکر آ گیا۔ پہلے تو وہ سمجھی دن بھر کی تھکن سے ایسا ہو رہا ہے مگر چکر بڑھتے ہی گئے اور سارا گھر گھومنے لگا تو الطاف کو آواز دینے کے لیے اٹھی مگر اٹھ نہیں سکی، اسے ایسا لگا جیسے پیٹ میں بجلی سی کوند گئی ہو۔ درد اتنا شدید تھا کہ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ الطاف، حسینہ اور دوسرے کچھ لوگ جاگ گئے۔ اکبری کو بڑے اسپتال لے جایا گیا تب تک وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ اکبری کو زہر دیا گیا ہے۔ قسمت اچھی تھی کہ جان بچ گئی۔ مگر پولیس کا کیس بن گیا، انکوائری شروع ہوئی۔ ہوش آیا تو اکبری نے بتایا کہ حسینہ کی بنائی ہوئی میٹھی پوریوں کے سوا اس نے کچھ اور نہیں کھایا تھا۔ مگر میٹھی پوریاں تو سب نے کھائی تھیں۔ کسی کے پیٹ میں درد نہیں ہوا۔ پولیس حسینہ کا بیان لینا چاہتی تھی مگر الطاف نے تھانے دار کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے:

"آپ خود سوچیے سرکار، پوریوں میں کچھ ہوتا تو باقی سب بھی اسپتال میں ہوتے۔" مگر زہر کا معاملہ تھا، موت بھی ہو سکتی تھی اس لیے تھانے دار الطاف کی بات ماننے کے تیار نہیں تھا: "تو پھر تیری بیوی کو دھتورے کے بیج پیس کر کس نے کھلا دیے اور کیسے کھلائے؟"

کونے میں بیٹھی حسینہ روئے جا رہی تھی۔ اس کے گالوں پہ آنسوؤں کی لکیریں بن گئی

تھیں۔ الطاف تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا:

"سرکار مالک ہیں، جو چاہے فیصلہ کریں، مگر میری سمجھ میں ایک بات آرہی ہے۔"
تھانے دار نے سر ہلایا "بول کے دیکھ لے، شاید مجھے اچھی لگے۔" الطاف نے سر ہلایا اور آہستہ سے بولا:

"دونوں سوتن ہیں سرکار، دونوں میں بنتی بھی نہیں ہے، دن رات تکا فضیحتی ہوتی رہتی ہے۔ دونوں کے چولہے بھی الگ ہیں۔ مجھے لگتا ہے اس نے اپنی جان کو ختم کرنے کے لیے کھالیا ہو گا دھتورا"

"تیرا مطلب ہے یہ اقدام خودکشی کا کیس ہے"

"اب یہ تو نہیں معلوم سرکار کاہے کا کیس ہے، مگر بات یہی ہے۔"

"ہوں" تھانے دار نے کہا اور ٹہلتا ہوا نکل گیا۔

چوں کہ نہ کوئی ثبوت تھا نہ کوئی گواہ اور نہ ہی اکبری کسی پہ الزام لگا رہی تھی اس لیے تھانے دار نے بھی وقت برباد کرنا ٹھیک نہیں سمجھا اور کوئی کیس ہی نہیں بنایا۔

اکبری آٹھ دن تک اسپتال میں پڑی رہی اور جب واپس آئی تو اس میں چلنے کی طاقت بھی نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں کو سنبھالتے ہوئے الطاف سے کہا:

"اس نے جھوٹی قسم کھائی، تو نے جھوٹی گواہی دی، تم دونوں کا حشر اچھا نہیں ہوگا۔"

الطاف نے غصے میں آنکھیں چمکائیں اور بولا:

"تو سمجھتی ہے یہاں گدھے بستے ہیں، سب کو معلوم ہے تیرا منصوبہ کیا تھا؟"

"منصوبہ؟" اکبری کے منہ سے نکلا۔

"اور نہیں تو کیا، تو یہی چاہتی تھی ناکہ حسینہ جیل چلی جائے اور منجو تیرے پاس رہے۔ زہر ہی کھانا تھا تو ذرا زیادہ کھالیا ہوتا، سب کی جان چھوٹ جاتی۔"

اکبری پھٹی پھٹی آنکھوں سے الطاف کو دیکھتی رہی، اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی بھرائی ہوئی آواز نکلی:

"اللہ تجھے معاف نہیں کرے الطاف، کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

"ارے چل چل" الطاف برا سا منہ بنا کر بولا:

"کوے کے کوسے سے ڈھور نہیں مرتے" اور اٹھ کر چلا گیا۔

اکبری جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں اس طرح لال ہوگئی تھیں جیسے ان میں خون جم گیا ہو۔ پھر نہ جانے کہاں سے اس میں اتنی طاقت آگئی کہ وہ اٹھی، اوڑھنی سر پہ ڈالی اور باہر نکل گئی۔

چار دن کے بعد جب الطاف کو پنچایت میں آنے کا حکم ملا تو وہ پریشان ہوگیا۔ ایسی تو کوئی بات ہوئی ہی نہیں تھی کہ اسے پنچایت میں بلایا جاتا۔ کسی سے لین دین پہ جھگڑا بھی نہیں ہوا تھا اور گھر میں بھی سب خیریت تھی، پھر یہ طلبی کیوں......

الطاف پنچایت میں پہنچا تو سب لوگ جمع ہو چکے تھے۔ چاچا غفور کے طویلے کے باہر برگد کے پیڑ کے نیچے جو چبوترا تھا اس پر پنچ اور سرپنچ بیٹھے ہوئے تھے اور حقے کا دور چل رہا تھا۔ نیچے ایک پرانی دری پر دیکھنے والے بیٹھے تھے۔ ان سے تھوڑی دور پر ایک چارپائی پر چار پانچ عورتیں بھی بیٹھی ہوئی تھیں جنھوں نے مردوں کی نظر سے بچنے کے لیے یا بڑوں کے ادب میں اوڑھنیوں کے گھونگھٹ نکال لیے تھے۔ الطاف نے پنچوں کو سلام کیا اور سرپنچ سے پوچھا:

"مجھے کیوں بلایا گیا ہے چاچا؟"

غفورا نے ایک لمبا کش لے کر حقہ برابر والے کو پکڑا دیا اور اپنی بڑی سی سفید پگڑی دونوں ہاتھوں سے سیدھی کر کے اونچی آواز میں بولا:

"تیری بیوی اکبری کو تجھ سے طلاق چاہیے۔"

"طلاق؟"...... اکبری کو طلاق چاہیے یہ بات تو الطاف نے کبھی سوچی ہی نہیں تھی۔ اس نے عورتوں کی طرف دیکھا اور پہچان لیا کہ کالی اوڑھنی میں اکبری بھی بیٹھی ہوئی ہے۔

"ابے سوچ کیا رہا ہے کچھ ہاں یا نہ بول"

الطاف نے گلا صاف کیا:

"اکبری کو مجھ سے شکایت کیا ہے جی، میں نے اس پہ کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا، گالی بھی نہیں دی، ہمیشہ کھانے کپڑے کا دھیان رکھا، جو اس کے من میں آیا کرنے دیا۔ اب چودہ برس کے بعد اسے طلاق کی کیا سوجھ رہی ہے۔ رہ گئی بات دوسری بیوی کی تو پنچوں کو تو سب معلوم ہے، جب اس نے سات برس تک کوئی بچہ نہیں جنا خود اس نے میرا بیاہ کرایا، لونڈیا بھی اسی نے پسند کی تھی، اس کو مجھ سے شکایت کیا ہے؟"

وہ چپ ہوا تو سب کی آنکھیں اکبری کی طرف مڑ گئیں۔ اکبری کھڑی ہوگئی، اس نے اپنی اوڑھنی سرکائی اور ہاتھ جوڑ کر بولی:

"انھوں نے جو کچھ بھی بولا اس کا ایک ایک حرف صحیح ہے، مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ شکایت تو مجھے اپنے آپ سے ہے کہ میں ان کی، ان کی بیوی کی اور ان کے بچے کی ویسی خدمت نہیں کر سکتی جیسی مجھے کرنی چاہیے اور آپ سب لوگ تو تجربے والے لوگ ہیں، آپ کو تو معلوم ہے جو بھینس دودھ دینا بند کر دے اسے طویلے سے نکال دیتے ہیں۔ مجھے ان سے کچھ نہیں چاہیے، اس گھر میں میرا جو کچھ بھی ہے آج سے ان کا ہے۔ میں اپنا مہر بھی معاف کرتی ہوں۔ اگر یہ دے سکتے ہیں تو میری دو چیزیں لوٹا دیں، احسان مانوں گی۔"

"کون سی دو چیزیں؟" الطاف نے پوچھا۔

"میری گنگا اور لکشمی......"

الطاف ہنسا:

"شوق سے لے لے، میں کیا کروں گا بڑھیا بھینسوں کو رکھ کے، مگر تو اس

عمر میں جائے گی کہاں اور کرے گی کیا؟"

اکبری نے پہلی مرتبہ مڑ کر الطاف کو دیکھا اور بولی:

"تو میری چنتا مت کر، یہ ترکئی کے ہاتھ ہیں جو مرتے وقت تک چلتے رہتے ہیں۔ دودھ دوہنے کو نہیں ملا تو گوبر تو اٹھا ہی سکتی ہوں......"

ایک پنچ نے اشارے سے اکبری کو روکا اور الطاف سے پوچھا:

"ہاں بھئی الطاف، کیا ارادہ ہے تیرا، فیصلہ تو کرے گا یا پنچایت کر دے؟"

الطاف تھوڑی دیر تک سوچتا رہا، شاید دل ہی دل میں حساب لگا رہا تھا کہ اکبری کو چھوڑنے میں فائدہ ہے یا رکھنے میں۔ اس نے کن انکھیوں سے اکبری کی طرف دیکھا۔ مرجھایا ہوا چہرہ، آنکھوں پہ کالے داغ، سر میں سفید بال، وہ آگ جو کبھی اکبری تھی بجھ چکی تھی۔

"ٹھیک ہے جی......" اس نے پنچوں سے کہا:

"اگر اس کی یہی مرضی ہے تو یہی سہی، میں طلاق دینے کو تیار ہوں۔ آگے جو پنچوں کا حکم......"

اکبری کی طلاق ہو گئی، وہ اپنی دونوں بھینسوں کو لے کے باپ کے گھر میں رہنے لگی۔ جس دن اس نے بند طویلے کا دروازہ کھولا اسی دن یہ منحوس خبر ملی کہ محمد احمد مکہ شریف میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اکبری بہت روئی مگر یہ سوچ کر دل کو تسلی بھی دیتی رہی کہ باپ نیک آدمی تھا، ایسی جگہ مرا جہاں مرنے والا سیدھا جنت میں جاتا ہے۔

اکبری نے اپنی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش شروع کر دی۔ فجر سے پہلے اٹھتی، دودھ نکالتی، سانی پانی کرتی، گراہکوں کے گھر دودھ پہنچاتی اور پھر دن بھر لکشمی اور گنگا سے باتیں کرتی رہتی۔ اسے کسی بات کا دکھ نہیں تھا مگر جب کبھی منجو کا خیال آجاتا تو ایسا لگتا جیسے جلتے کوئلے پہ ہاتھ پڑ گیا ہو۔ جب اس نے سنا کہ منجو میونسپلٹی کے اسکول میں جانے لگا ہے تو اس سے ملنے بھی گئی۔ منجو اس سے لپٹ گیا، اکبری نے بہت سے کھلونے اور مٹھائی جو اپنے ساتھ لے کر گئی تھی اسے دے کر کہا:

"خوب پڑھنا، بڑا افسر بننا اور ماں باپ کا نام روشن کرنا۔"

کوئی چھ مہینے بعد کی بات ہے کہ الطاف آدھی رات کو اس کے گھر پہنچا۔ اس کی حالت دیکھ کر اکبری ڈر گئی۔ منہ پہ ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں، بال بکھرے ہوئے تھے، کپڑے میلے تھے اور ننگے پاؤں تھا۔

اکبری کو سامنے دیکھ کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، پتا چلا کہ حسینہ اور منجو دوپہر سے غائب ہیں۔ سارے شہر میں وہ جہاں جہاں جا سکتی تھی ڈھونڈا جا چکا ہے مگر اس کا کوئی پتا نہیں ہے۔ پولس میں رپٹ بھی لکھائی جا چکی ہے اور پولس والے دونوں کا حلیہ شہر شہر بھیج رہے ہیں مگر ابھی تک کوئی خبر کہیں سے نہیں آئی ہے۔ الطاف زمین پر بیٹھ گیا اور اپنے بچے کو یاد کر کے رونے لگا۔ اکبری بھی اس کے پاس بیٹھ گئی اور رونے میں شریک ہو گئی۔ اکبری بھی کئی دن تک ڈھونڈتی پھری مگر نہ حسینہ ملی نہ منجو......

کوئی آٹھویں دن دہلی سے آنے والے ایک آدمی نے بتایا کہ اس نے حسینہ اور منجو کو لاہور جانے والی ٹرین میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ ایک پٹھان ملا بھی تھا۔ الطاف تو جیسے پاگل ہو گیا۔ حسینہ کی بیوفائی، بچے کی جدائی اور اپنی بدنامی کا ایسا اثر ہوا کہ اس نے شراب پینی شروع کر دی۔ نشے میں جھومتا سڑکوں پہ گھومتا رہتا تھا اور کوئی جان پہچان والا مل جاتا تو اس سے ایک ہی بات پوچھتا:

"منجو کو دیکھا ہے تم نے؟"

اکبری نے اسے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کی دماغی حالت ایسی ہو چکی تھی کہ وہ کچھ بھی سوچنے یا سمجھنے کے قابل نہ تھا۔ اس کی لاپرواہی اور شراب نوشی کے نتیجے میں پہلے جانور بکے پھر طویلہ بکا اور آخر میں گھر بھی بک گیا۔ الطاف سب کی شراب پی گیا۔ وہ اپنے ہی گھر کے پاس اس چھپر میں پڑا رہتا تھا جہاں کبھی اس کی بھینسوں کے لیے چارہ رکھا جاتا تھا۔

اکبری کے حالات بھی ٹھیک نہیں تھے، لکشمی مر چکی تھی اور گنگا مشکل سے دو تین سیر دودھ دیتی تھی اور بس، مگر عورت جی دار تھی اس نے گنگا کے تھوڑے سے دودھ کا دہی بنانا اور دہی

پھلکیاں بنا کر بیچنا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں تو لوگ ہنستے تھے کہ ایک ترکنی دہی پھلکیاں اور کباب بیچنے لگی ہے مگر دھیرے دھیرے اس کے ہاتھ کی لذت شہرت میں اور شہرت عزت میں بدل گئی۔

یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ گھر گھر جا کے ایک آنے دو آنے کی پیالیاں بیچنے والی اکبری ہر مہینے الطاف کی پڑوسن کو تیس روپے دیا کرتی تھی۔ ہوا یوں کہ کسی نے اکبری کو خبر پہنچائی کہ الطاف بہت بیمار ہے اور کوئی اس کا پرسان حال بھی نہیں ہے۔ الطاف نے جو کچھ بھی اس کے ساتھ کیا تھا وہ تو ایسا تھا کہ اکبری کو اس کی صورت بھی نہیں دیکھنی چاہیے تھی مگر اکبری کی نرم دلی اور شریف طبیعت آڑے آ گئی۔ الطاف کے طویلے میں پہنچی تو وہ بے ہوش پڑا تھا مگر یہ بے ہوشی بیماری کی نہیں شراب کی تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ بال روکھے اور الجھے، کئی دن کی بڑھی ہوئی داڑھی جو سفید ہو گئی تھی اور اتنے میلے کپڑے کہ ان میں سے بو آ رہی تھی۔ جھوپڑے میں سامان نام کی کوئی چیز نہیں تھی بس ایک ٹوٹی کھاٹ تھی جس پر الطاف پڑا ہوا تھا اور کھاٹ کے نیچے خالی بوتلوں کا ڈھیر۔ اکبری کو ترس تو بہت آیا مگر کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس نے اپنی پرانی پڑوسن کو بلایا، اس کے ہاتھ میں کچھ روپیے رکھے اور کہا کہ اگر وہ الطاف کو دونوں وقت کھانا کھلا دیا کرے، اس کے کپڑے دھو دیا کرے اور جھوپڑے کی صاف صفائی کر دیا کرے تو مہین داری دینے کو تیار ہے۔ پڑوسن تیس روپے مہینے پر الطاف کی خدمت کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔

زندگی پھر اسی طرح ٹھوکریں کھاتی چلنے لگی۔ اکبری اسی طرح سر پہ ٹوکری اٹھائے کباب اور پھلکی لیے گھروں کے چکر لگاتی رہی کہ اچانک ایک دن غائب ہو گئی۔

وہ جن گھروں میں جاتی تھی ان میں سے کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں چلی گئی۔ کسی نے کہا بیمار ہو گئی ہو گی، کسی نے کہا اپنی بہن کے پاس چلی گئی ہو گی، کسی کی رائے تھی کہ اس نے کوئی دوسرا کاروبار شروع کر دیا ہو گا۔ مگر جب کبھی شام ہوتی تو بہت سے گھروں میں اکبری کو یاد کیا جاتا:

"اے اتنا اچھا موسم ہے اگر اکبری بوا گرم گرم کباب لے کے آجاتی تو کیا مزا آتا۔"

مگر اکبری نہیں آئی اور پھر کوئی چھ مہینے بعد ایک دن اچانک بوا نمودار ہو گئیں۔ گیلے کپڑے سے ڈھکی ہوئی بڑی سی ٹوکری سر پہ اٹھائے ودیا ساگری جوتی سے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی اکبری بوا نے جیسے ہی آنگن میں قدم رکھا گھر کی ساری ہلچل ایک دم رک گئی۔ دوڑتے بھاگتے شور مچاتے بچوں نے کھیلنا چھوڑ کر بوا کو دیکھا اور ان کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

باجی باورچی خانے سے چلائیں:

"ارے اکبری بوا، اللہ کتنے دنوں کے بعد آئی ہو......"۔

فیاضی بیگم حقے کا کش لیتے لیتے رک گئیں اور آواز اونچی کر کے بولیں:

"اے اکبری تو کہاں غائب تھی اتنے مہینوں سے؟"

بوا نے ٹوکری چبوترے پہ رکھی اور ایک پیڑھی گھسیٹ کر ٹوکری کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

"اے کیا پوچھ رہی ہوں میں، کیا بیمار تھی؟"

فیاضی بیگم پھر بولیں۔ بوا نے اپنی میلی اوڑھنی سے پسینہ پونچھا اور کہا: "عدت میں تھی۔"

"عدت، کیا تو نے دوسرا نکاح کر لیا تھا؟"

"اے اللہ نہ کرے میں کیوں کرتی دوسرا نکاح، وہ الطاف گزر گیا نا......"

تب تک باجی بھی باورچی خانے سے باہر آچکی تھیں وہ چونک پڑیں:

"الطاف، مگر اس نے تو تمھیں طلاق دے دی تھی"

"ہاں وہ تو دے دی تھی، مگر میرا مرد تو تھا نا"

"طلاق کے بعد وہ تیرا مرد کیسے رہا، شوہر مر جائے تو اس کی بیوہ چار مہینے دس دن گھر میں بیٹھتی ہے جسے عدت کہتے ہیں، تو اس کی بیوی تھی کیا جو عدت کر رہی تھی؟"

بوا کچھ پریشان ہو گئیں:

"پہلے تو تھی نا"

"ہٹ دیوانی" فیاضی بیگم ہنس پڑیں:

"عدت تو اسے کرنی چاہیے تھی کیا نام تھا اس کا، ہاں حسینہ، بیوہ تو وہ ہوئی ہے"

اکبری نے برا سا منہ بنایا اور ہاتھ نچا کر بولی:

"اس حرام زادی کو تو خبر بھی نہیں ہوگی، وہ تو اپنے یار کے ساتھ عیش کر رہی ہوگی پاکستان میں"

فیاضی بیگم نے کہا:

"ارے کسی ملا سے ہی پوچھ لیا ہوتا؟"

"اب جو ہوا سو ہو گیا وہ میرا مرد تھا یا نہیں تھا، مجھے جو کرنا تھا میں نے کیا۔ اس کا موت گڑا کیا، تیجہ، دسواں، چالیسواں بھی کیا۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا، اب میرے جی پہ کوئی بوجھ نہیں ہے"

باجی ہنسیں اور بولیں:

"طلاق کے بعد عدت، اکبری بوا تم سچ مچ دیوانی ہو"

"اے خاک ڈالو ان باتوں پہ، یہ بتاؤ چھوٹی پیالی بناؤں یا بڑی...... پھلکی ایک دم تازہ ہے......!"

☆☆☆

ایک بے حد شریف آدمی

مولانا آزاد روڈ پر جہاں زیادہ تر اردو اخباروں کے دفتر تھے۔ایک دفتر شام نامہ "آج" کا بھی تھا۔ دفتر کیا تھا ایک چھوٹی سی دوکان تھی جس کے اندر ایک وقت میں سات آٹھ آدمی مشکل سے سما سکتے تھے۔ دائیں ہاتھ پر دو میزیں کچھ کرسیاں اور بائیں طرف کاتبوں کے بیٹھنے کی جگہ۔ اوپر ایک مالیہ بھی تھا جہاں سر اٹھانے کی گنجائش نہیں تھی۔

"آج" کے مالک خلیل احمد شیخ جو خلیاش کہلاتے تھے، بڑی ہی پیاری شخصیت کے مالک تھے۔ہمیشہ ہنستے رہتے بلکہ ہنساتے بھی رہتے۔ان کی ذہین شرارت کی تعریف میں ایک قصہ سن لیجیے۔ان کے دو خاص کاتب تھے، عبداللہ موٹا اور دبلا عبدالرحمن جو ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔خلیاش کو نہ جانے کہاں سے ایک حدیث مل گئی۔انھوں نے حدیث شریف کو فریم کرایا اور کاتبوں کے پیچھے دیوار پر لگا دیا۔وہ حدیث تھی:

> "اللہ کے سب سے زیادہ پسندیدہ نام ہیں عبداللہ اور عبدالرحمن" اور کوئی پوچھتا تو خلیاش بہت سنجیدگی سے کہتے، میری خوش نصیبی کہ اللہ کے پسندیدہ بندے میرے ہاں کام کر رہے ہیں۔اس حدیث کا اثر یہ ہوا کہ عبداللہ اور عبدالرحمن کی چونچیں بند ہو گئیں۔

ہاں تو ان خلیاش صاحب کو نہ جانے کس نے سمجھا دیا کہ شام کے اخبار میں کوئی فائدہ نہیں، ترقی کرنا ہے تو صبح کا روزنامہ نکالو۔چناں چہ فوراً اعلان کر دیا گیا اور اخبار کا نام رکھا گیا

"آشکار"۔ اس زمانے میں انقلاب میں کام کرنے والے صحافی تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کر رہے تھے اور عبدالحمید انصاری صاحب باوجود اس کے کہ انقلاب ہزاروں کی تعداد میں چھپتا تھا، پیسے بڑھانے کا نام سنتے ہی اردو کی بری حالت کا ذکر کرنے لگتے تھے۔ چناں چہ میں اور محمود راہی آشکار میں چلے آئے۔ آشکار کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا شعلہ بیان صحافی شہریار عابدی کو۔ داد دیجیے خلیاش کی ہمت کی کہ اس آٹھ بائی دس کی دوکان سے تین اخبارات شائع ہونے لگے۔ روزنامہ "آشکار"، شام نامہ "آج" اور فلم ویکلی "الماس"۔

کام تین شفٹ میں ہوتا تھا:

پہلی شفٹ صبح ۶ بجے سے ۱۰ بجے تک......شام نامہ آج

دوسری شفٹ گیارہ سے دو بجے تک......ہفت روزہ الماس

شام پانچ بجے سے گیارہ بجے رات تک......روزنامہ آشکار

کمال کا Adjustment تھا۔

"نہ شب کو دن سے شکایت، نہ دن کو شب سے ہے!"

اس انتظام پر وہ کوزہ بھی شرمندہ ہو گیا ہوگا جس میں سمندر سما جاتا ہے۔

آشکار کا دفتر، دفتر کم کلب زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ جس میں صبح سے رات تک طرح طرح کے لوگ آتے جاتے رہتے اور لطیفوں، جملے بازیوں، قہقہوں کے بیچ ایک اہم اور ذمہ دارانہ کام بھی ہوتا رہتا۔ عجیب ماحول تھا، زندگی اور زندہ دلی سے بھرپور۔

اس دفتر میں آتے جاتے ایک صاحب نظر آیا کرتے تھے۔ موٹاپے کی حدوں کو چھوتا ہوا بدن، گول چہرہ، سانولا رنگ اور ہمیشہ زمین کی طرف جھکی ہوئی آنکھیں۔ ان کے بال بہت اچھے لگتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی ابھی سر دھو کر تیل کنگھی کر کے آرہے ہوں۔ آڑی مانگ نکالتے تھے اور مجال ہے کہ ایک بال بھی بانکا نظر آئے۔ چہرے پر اس بلا کی معصومیت کہ دیکھتے ہی ان کی شرافت کا یقین ہو جاتا تھا۔ عام طور پر آدھی آستین کی دھاری دار یا چارخانے والی بش شرٹ اور ایک بڑے پائنچوں والی ڈھیلی ڈھالی پتلون پہنتے تھے۔ پیر میں ہمیشہ باٹا کی چپل پہنا

کرتے تھے۔ انھیں جب بھی دیکھا یوں دیکھا کہ گردن جھکائے، دایاں کندھا اوپر بایاں نیچے کیے تیزی سے "آج" کے دفتر میں گھسے، کسی میز کے کونے پر کاغذ رکھ کے کچھ لکھا، کاتب کے حوالے کیا، اور جس تیزی سے آئے تھے اسی تیزی اور خاموشی سے لوٹ گئے!

جب میں "آشکار" کے دفتر پہنچا تو ان صاحب کو حسب معمول سر جھکائے، کچھ لکھتے اور پھر خاموشی سے باہر جاتے دیکھا۔ پتہ چلا یہ عبدالحمید بیکس ہیں۔ کارٹونسٹ ہیں اور روزنامہ آج کے لیے انگلش فلموں پر تبصرہ لکھتے ہیں۔ بولتے بہت کم ہیں، عام طور پر الفاظ کی جگہ ایک شرمائی لجائی مسکراہٹ سے کام نکال لیتے ہیں......!

"آشکار" کچھ دنوں بعد بند ہوگیا، میں روزنامہ 'خلافت' میں واپس چلا گیا، راہی 'انقلاب' میں اور شہریار عابدی 'اردو ٹائمز' میں لوٹ گئے۔ دوری کی وجہ سے مولانا آزاد روڈ پر آنا جانا بند ہوگیا اور دوستوں سے ملاقات بھی۔ بیکس صاحب بھی ذہن سے اتر سے گئے۔ ویسے بھی ان سے اپنا رشتہ ایک سلام اور ایک مسکراہٹ سے زیادہ کا نہ تھا۔

۱۹۶۶ء میں حکومت مہاراشٹر کے دل میں اچانک نیکی آئی اور اس نے بے گھر صحافیوں کو گھر الاٹ کر دیے۔ ان خوش نصیبوں میں سے ایک میں بھی تھا۔ مجھے نہرو نگر کرلا کی بلڈنگ ۳۷ کے چوتھے مالے پر مبلغ دو کمرے پاخانے، غسل خانے، دو کھڑکیوں اور ایک الماری کے ساتھ عنایت کیے گئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فریدہ کے والدین نے بیٹی کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور مجھے ان سے ملنے بلکہ ساتھ گھومنے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔ چناں چہ جیسے ہی گھر ملا میں نے سہرا فریدہ کی قسمت کے سر باندھ دیا۔ (بیویاں شوہروں کی ایسی باتوں سے بہت دن تک خوش رہتی ہیں) اور ایک دن نہرو نگر لے جا کر چابی ہاتھ میں دی اور عرض کیا کہ اپنے مبارک ہاتھوں سے تالہ کھولیے اور دہلیز کو پاؤں چومنے کا موقع دیجیے۔ دروازہ کھلا تو ایک کبوتر میرے سر کے اوپر سے اور دوسرا کھڑکی سے نکل بھاگا۔ کم بخت گھر کی تنہائی اور ویرانی سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ہم دونوں ہال میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھتے رہے۔ دھول مٹی تھی، جالے تھے، کبوتروں کی بیٹ تھی۔ پھر بھی اچھا لگ رہا تھا کیوں کہ چھت اپنی تھی!

اچانک دروازے سے آواز آئی:

”حضور......!“

پلٹ کر دیکھا تو بیکس صاحب۔ وہی مسکراہٹ، وہی جمے ہوئے بال، وہی ڈھیلی ڈھالی بش شرٹ اور وہی تھیلا نما پتلون۔ چپل بھی وہی......!

”ارے آپ یہاں کہاں؟“

میں نے حیرت سے پوچھا۔ سر جھکا کے بولے:

”اس مالے پر پہلا فلیٹ میرا ہی ہے۔ آپ آئے تو میں نے دیکھ لیا تھا۔ مبارک ہو“

”شکریہ شکریہ۔ آئیے آئیے اندر آئیے!“

”اگر آپ کے پاس وقت ہو تو صفائی کروا لیجیے۔ پانی آ رہا ہے۔ میں بالٹی اور جھاڑو لے کر آتا ہوں۔...“

ہم نے بیکس صاحب کی مدد سے پورا گھر دھو ڈالا اور جب پتھر کے چمکتے ہوئے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر باجی (مسز بیکس) کی لائی ہوئی چائے پی تو سمجھ میں آیا کہ پرانے لٹریچر میں پڑوسی کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے اور اسے ہم سایہ کیوں کہا گیا ہے۔

بیکس صاحب سینٹرل ریلوے میں پینٹر تھے۔ وی ٹی سے تھانہ کلیان تک دوڑنے والی ہر ٹرین کے تقریباً ہر ڈبے پر بیکس صاحب کے بنائے ہوئے Emblems اور Logos آج بھی نظر آتے ہیں۔ وہ کوئی بڑی ڈگری نہیں رکھتے تھے مگر اردو ہندی اچھی طرح جانتے تھے اور انگلش پڑھ بھی لیا کرتے تھے، بلکہ کچھ بھی لیا کرتے تھے۔ ناول پڑھنے اور انگریزی فلمیں دیکھنے کے علاوہ بظاہر کوئی شوق نہیں تھا۔ نہ پان نہ سگریٹ، نہ شراب۔ کھانے پینے کے معاملے میں بھی فقیرانہ طبیعت پائی تھی۔ یعنی جو مل گیا اسی کو مقدر سمجھ لیا......!

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی اور شوق نہ تھا تو پھر تخلص کیوں پال رکھا تھا۔ بزرگوں کا کہنا ہے شعر کا شوق پہلے پیدا ہوتا ہے تخلص کا نزول بعد میں ہوتا ہے۔ مگر بیکس صاحب کا بیان

ذراسا مختلف تھا۔ فرماتے تھے، یہ تخلص مشہور شاعر استاد محترم حضرت منیر کا عطا کردہ ہے اور اس کی لاج رکھنے کے لیے کبھی کبھی فکرِ سخن بھی کرنی پڑتی ہے۔ مجھے اُن کے تخلص پر، جو اُن کا نام ہی بن گیا تھا سخت اعتراض تھا۔ ایک تو یہ لفظ ہی ایسا ہے کہ سنتے ہی ترس آنے لگتا ہے، دوسرے ان کے دروازے پر جو نام کی تختی لگی تھی اس پر جلی حروف میں لکھا تھا: A H BEKAS...... جسے میں ''آہ بیکس'' پڑھا کرتا تھا اور اکثر کہتا تھا:

''یہ نیم پلیٹ بدل دیجیے بیکس صاحب۔ اسے دیکھ کر بالکل ایسا لگتا ہے

جیسے اردو اخبار میں انتقال پر ملال کی خبر شائع ہوئی ہو۔''

وہ سر جھکا کر مسکراتے اور دھیرے سے کہتے:

''جی بدل دوں گا''

یہ الگ بات ہے کہ وہ تختی کبھی نہیں بدلی بلکہ ان کی موت کے بعد بھی لگی رہی اور ویران گھر کو پرسہ دیتی رہی۔ مجاز نے کسی کے بارے میں کہا تھا:

''یہ اتنے شریف ہیں کہ انھیں کئی بار شریف کہنا پڑتا ہے۔''

بیکس صاحب کے بارے میں میرا بھی یہی خیال تھا۔ ان کی شخصیت میں شرافت کے وہ تمام عناصر موجود تھے جن کا ذکر پرانی کتابوں اور لغات میں ملتا ہے۔

بیکس صاحب کو بھی ایک بار شریف کہہ دینے سے کام نہیں چل سکتا تھا اور یہ شرافت غریبی کی مجبور انکساری نہیں تھی، ان کے کردار کی بنیاد تھی۔

ماشاء اللہ بھرا ہوا گھر تھا۔ محبتوں سے بھی اور بچوں سے بھی۔ چھ بچے تھے، چار بیٹیاں، دو بیٹے اور سب ماں باپ پر گئے تھے۔ نیک اور پیار کرنے والے۔ بیکس صاحب سے پوچھو تو اپنے سات بچے بتاتے تھے۔ انھوں نے ایک توتا بھی پال رکھا تھا، اس کا نام بھی تھا جو اب مجھے یاد نہیں۔ توتے کی بے مروتی مشہور ہے مگر بیکس صاحب کا توتا بالکل ویسا ہی تھا جیسا ان کی ساتویں اولاد کو ہونا چاہیے تھا۔ دن بھر گھر میں کھلا گھومتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی چوکھٹ پر آ کے بیٹھ جاتا اور گردن گھما گھما کر آنے جانے والوں کو دیکھا کرتا تھا مگر شام کو جب بیکس صاحب آتے تو اس کی

خوشی دیکھنے لائق ہوتی۔ زور زور سے چیختا، پر پھڑ پھڑاتا اور ان کے کندھے پر چڑھ کے بیٹھ جاتا اور کان سے چونچ لگا کر اس طرح مسلسل بولتا رہتا جیسے دن بھر کی رپورٹ دے رہا ہو۔ بیکس صاحب کھانا کھاتے، لکھتے یا پڑھتے تب بھی وہ طوطا نور جہاں کے ہاتھ کی طرح جہانگیر کے کندھے پر دھرا رہتا۔

بچوں کا ذکر چل رہا ہے تو ایک مزے دار قصہ سن لیجیے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ بیکس صاحب کے سارے بچے اپنے باپ کو چچا کہا کرتے تھے۔ میں نے دریافت کیا تو جواب ملا۔ پہلے دو بچوں تک بڑے بھائی کے ساتھ رہتے تھے اور چوں کہ بھتیجے چچا کہتے تھے اس لیے اپنے بچے بھی چچا ہی کہنے لگے۔ جس پر اس بھلے آدمی نے کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بچے ابا کہیں یا چچا۔ کیا فرق پڑتا ہے، ہیں تو اپنی ہی اولاد مگر پریشانی تب ہوئی جب یہ خاندان نہرو نگر میں منتقل ہوا اور نیا راشن کارڈ بنانے کی ضرورت پیش آئی۔ راشن آفس کو درخواست دی گئی تو وہاں سے ایک افسر چیکنگ کے لیے آیا۔ اس افسر نے بیکس صاحب کی سب سے چھوٹی بیٹی جو شاید تین برس کی تھی پوچھا:

"یہ تمہارے کون ہیں؟"

"چچا......!"منی نے جھٹ سے جواب دیا۔

افسر نے دوسرے بچے سے پوچھا۔ اس نے بھی یہی جواب دیا۔ افسر بھڑک گیا:

"ارے تمہارے کو شرم نہیں آتی۔ راشن یونٹ بڑھانے کے لیے بھائی کے بچہ لوگ کو اپنا بچہ بولتا ہے......!"

اسے لاکھ سمجھایا گیا۔ پوری کہانی اور اس کا پس منظر بتایا گیا مگر اسے یقین نہیں آیا۔ بے چارے بیکس صاحب کو حلف نامہ داخل کرنا پڑا تب کہیں جا کے راشن کارڈ کی صورت دیکھنے کو ملی۔ وہ یاروں کے یار تھے۔ ایک زمانے میں میرا دوست مشہور صحافی سردار عرفان میرے ساتھ رہنے لگا تھا۔ اسے مکان کی بڑی پریشانی تھی کیوں کہ خریدنے کی طاقت نہ تھی اور کرایے پر لینے کی شرط یہ تھی کہ فیملی ساتھ ہو۔

سر دار اکیلا آدمی، نہ کوئی آگے نہ پیچھے، فیملی کہاں سے لاتا اس لیے ہوٹلوں اور مسافر خانوں میں بھٹک رہا تھا۔ میں نے حال سنا تو کہا کمرے کا ایک کونا خالی ہے تم چاہو تو رات کو بستر بچھا سکتے ہو۔ سر دار کے آنے سے بیکس صاحب بھی بے حد خوش ہوئے۔ دونوں پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

سر دار کو میرے ساتھ رہتے کچھ ہی مہینے ہوئے تھے کہ ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سر دار کو ایک لڑکی سے عشق ہو گیا۔

اس لڑکی کو بھی سر داز میں خدا جانے کیا نظر آیا کہ جب بھی موقع ملتا ملنے کے لیے آجاتی۔ یہ ملاقاتیں بیکس صاحب کے گھر میں ہوا کرتی تھیں۔ باجی تو کچن میں بند ہو جاتیں اور بیکس صاحب باہر ٹہلتے رہتے یا میرے گھر میں آ کر بیٹھ جاتے۔

اس لڑکی اور سر دار کے تعلقات کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں تھے کیوں کہ دونوں جب بھی ملتے کھڑکی دروازہ کھلا رکھ کے ملتے اور کوئی آتا جاتا جھانک کر دیکھتا بھی تو دونوں کے بیچ گز بھر کی دوری تو ضرور ہی دکھائی دیتی مگر دنیا تو دنیا ہے۔

دیکھتی رہتی ہیں آنکھیں کون ہے کس رنگ میں
سوچتی رہتی ہے دنیا کس کو رسوا کیجیے

دھیرے دھیرے محلے والوں کی آنکھوں میں سوالیہ نشان دکھائی دینے لگے تو میں نے بیکس صاحب کو پکڑ لیا:

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟...... وہ مراٹھی برہمن لڑکی ہے، اگر کوئی ہندو مسلم لفڑا ہو گیا تو پہلی گردن آپ کی جائے گی، دوسری میری ......!''

وہ بہت دیر تک سر جھکائے کھڑے رہے پھر دھیرے سے بولے:

''میں چاہتا تھا کہ کسی طرح سر دار عرفان کا گھر بس جائے......!''

''اور آپ کے اپنے گھر کا کیا ہوگا؟''

میں نے بھڑک کر پوچھا۔ پھر ایک بار بہت دیر تک سر جھکائے رہے۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ؟''

میں نے پوچھا:

''جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں!''

''تو جائیے، سردار کو سمجھائیے......!''

انھوں نے خاموشی کا ایک لمبا غوطہ لگایا اور جب میں جھنجھلا کر اٹھنے لگا تو کچھ روہانسی آواز میں کہنے لگے:

''آپ ہی سمجھائیے حضور، میں تو ان کا دل نہیں توڑ سکتا......!''

وہ قصہ تو جیسے تیسے ختم ہوگیا۔ اس لڑکی کی شادی ہوگئی۔ سردار نے اپنا فلیٹ لے لیا اور نہرو نگر سے رخصت ہوگیا مگر بیکس صاحب کو برسوں افسوس رہا۔ اکثر کہا کرتے تھے:

''بے چارے سردار عرفان صاحب اب تک کنوارے ہیں......!''

اس بلڈنگ میں بہت سے جرنلسٹ جمع ہوگئے تھے۔ میرے ایک طرف مراٹھی ہفت روزہ ''شری'' کا ایڈیٹر وسنت سوپارکر رہتا تھا، دوسری طرف مہاراشٹر ٹائمز کا اشوک چوہان۔ اس کے آگے بیکس صاحب اور پھر سوویت لینڈ کا پرافل موکاشی......!

چوتھے مالے پر آؤ تو لگتا تھا کسی کلب گھر میں آگئے۔ سارے دروازے کھلے ہوئے، ہر گھر چشم براہ۔ کہیں بھی آئیے کہیں بھی بیٹھئے۔ عام طور پر میرے یا بیکس صاحب کے گھر میں محفل ہوتی یا پھر ٹیرس پر جلسہ جم جاتا۔ زوردار سیاسی مباحثے، فلموں کی باتیں، کرکٹ اور شعر و شاعری سے لے کر کھانے اور کھلانے تک کے سلسلے سال بھر تک چلتے رہتے اور تیوہار تو سونے پر سہاگہ۔

بیکس صاحب کی وجہ سے کبھی کبھی مجھے شعر بھی کہنے پڑتے تھے حالانکہ میں شاعری سے توبہ کر چکا تھا۔ ہوتا یوں تھا کہ ان کے پاس کسی مشاعرے کا بلاوا آجاتا اور وہ فکر سخن میں بے چین نظر آتے تو میں بھی ہمدردی کرنے پہنچ جاتا۔ دونوں مل کر دشت سخن میں گھوڑے دوڑا دیتے۔ کچھ شعر میں کہتا کچھ وہ موزوں کرتے اور تھوڑی سی محنت سے غزل تیار ہوجاتی جس کی میری نظر میں کوئی ادبی حیثیت نہ ہوتی مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے، زیادہ تر شاعری ادب

کے لیے نہیں مشاعرے کے لیے کی جاتی ہے۔ اگر غزل پسند کر لی جاتی تو مشاعرے کے دوسرے دن دعوت ہوتی، باجی کے ہاتھ کے پراٹھے، آلو کی قتلی اور میری پسندیدہ تلی ہوئی ہری مرچیں۔ اے سبحان اللہ، ایسی بے مزہ تک بندیوں کی اتنی لذیذ قیمت بھلا کس کو ملی ہو گی......!

بیکس صاحب ایسے کوئی خوش حال نہیں تھے۔ ریلوے ورکشاپ سے جو تنخواہ ملتی تھی بس وہی کل آمدنی تھی۔ اخباروں میں لکھ کر یا کارٹون بنا کر جو ملتا وہ بچوں کے بسکٹ خریدنے کے لیے بھی ناکافی ہوتا۔ مگر رکھ رکھاؤ والے آدمی تھے، بیوی بھی سگھڑ تھیں اس لیے ان کی غریبی نے کبھی کھڑکی دروازے سے نہیں جھانکا ہمیشہ گھر کے اندر ہی رہی۔ مگر ضرورت تو ضرورت ہوتی ہے اسے چھپایا تو جاسکتا ہے دبایا نہیں جاسکتا۔ بیکس صاحب کے گھر میں بھی ضرورتیں بچوں کے ساتھ جوان ہو رہی تھیں۔ ایک دن کھڑکی میں سے ان کی آواز سنائی دی:

"حضور......!"

بیکس صاحب کا حضور اتنا لمبا ہوتا تھا کہ انگلش میں لکھا جائے تو پانچ "O" لگانے پڑیں۔ میں نے "آئیے......!" کہا، وہ آگئے۔ مسکرا رہے تھے مگر مسکراہٹ کے تیور الگ تھے۔ آواز دبا کر کہنے لگے:

"حضور ایک ایسی بات معلوم ہوئی ہے کہ ہر مہینے اچھی خاصی انکم ہو سکتی ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی خبر ہے......!" میں نے کہا۔

"آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی......!"

"میں تیار ہوں۔ بات کیا ہے؟"

بیکس صاحب نے جو بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ آج کل اردو اور ہندی میں جاسوسی ناولوں کا بڑا زور ہے۔ ابن صفی کا "جاسوسی دنیا" لاکھوں کی تعداد میں بکتا ہے۔ یہی حال دہلی کے ماہنامہ "جاسوسی پنجہ" کا بھی ہے جس میں ہمارے دوست اکرم الہ آبادی ہر مہینے ایک ناول لکھتے ہیں۔ اور جو اپنے نہایت بے ہودہ نام کے باوجود بے حد مقبول ہے۔"

''مطلب کی بات پر آیئے بیکس صاحب!'' میں نے کہا۔

''اکرم بھیا ملنے تھے کہہ رہے تھے انھیں ڈیڑھ سو صفحے کے ناول کے پانچ سو روپے ملتے ہیں۔ مگر اب وہ میونسپل کارپوریٹر ہو گئے ہیں۔ لکھنے کا وقت نہیں ملتا ہے۔ اس لیے ''جاسوسی پنجہ'' والے نئے لکھنے والوں کی تلاش میں ہیں۔''

بیکس صاحب نے یہ سب کچھ اس طرح بتایا جیسے گھر میں سونا بنانے کا نسخہ بتا رہے ہوں اور یہ ڈر ہو کہ کوئی سن نہ لے۔

''آپ چاہتے ہیں کہ میں جاسوسی ناول لکھوں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی......!''

انھوں نے سر ہلایا۔

''حضور اتنی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔ آپ کے لیے کیا مشکل ہے؟''

''یہ میرے بس کا کام نہیں ہے بھائی۔ جاسوسی ناول لکھنے کے لیے الگ طرح کا دماغ چاہیے......!''

میں نے انھیں ٹالنا چاہا مگر وہ ٹلے بھی نہیں۔ بس ذرا سا پہلو بدلا اور بولے:

''اچھا تو میں لکھتا ہوں۔ حضور پلاٹ وغیرہ میں تو مدد کریں گے نا؟''

قصہ مختصر یہ کہ بیکس صاحب نے ''جاسوسی پنجہ'' کے لیے ناول لکھنا شروع کر دیا۔ جب دیکھیے، مسہری کے کونے میں ایک تختہ گود میں رکھے بیٹھے ہیں اس کے اوپر ایک موٹی سی کاپی ہے۔ ہاتھ میں قلم اور رکند ھے پر تو تا......!

کوئی ایک مہینہ دن رات محنت کر کے انھوں نے ناول مکمل کر لیا اور سنایا، اور مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ اس زمانے میں چھپنے والے ان سیکڑوں ناولوں سے بہتر تھا جن کا نہ سر ہوتا تھا نہ پیر......!

ناول دلی گیا اور بیکس صاحب نے حساب لگانا شروع کیا کہ پانچ سو روپے ماہوار کی مستقل آمدنی سے کون کون سے ضروری کام انجام دیے جائیں گے......!

دلی سے کئی مہینے تک جواب ہی نہیں آیا۔ کئی بار یاد دہانی کرانے پر ایک لفافہ موصول ہوا جس میں صرف دو سطریں تھیں:

''محترم آپ کا لکھا ہوا ناول موصول ہوا۔ چوں کہ آپ کا ناول ہمارے معیار پر پورا نہیں اترتا اس لیے ہم شائع کرنے سے قاصر ہیں......!''

بیکس صاحب نے کچھ نہیں کہا مگر ان کی جھکی ہوئی آنکھوں کی سرخی نے بہت کچھ کہہ دیا۔ کچھ دن بعد ان کا ناول شائع تو ہوا مگر کسی دوسرے میگزین میں، کسی اور کے نام سے...... زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ یہ ادبی سرقہ قابل دست اندازیِ پولیس بھی نہیں تھا۔

ایک دن ایک عجیب منظر دکھائی دیا کہ آگے آگے بیکس صاحب اور پیچھے مزدور کے سر پر لکڑی کی ایک پرانی رنگ اتری ہوئی میز جس کی چوتھی ٹانگ بھی غائب تھی۔

''اس لنگڑی میز کا کیا کریں گے آپ؟'' میں نے پوچھا۔

وہ مسکرائے اور اپنے مخصوص انداز میں سر جھکا کر بولے:

''دیکھتے جائیے......!''

موصوف نے پہلے تو میز کی باقی تین ٹانگیں بھی نکال کر پھینک دیں پھر تختے کو پالش کر کے شیشے کی طرح چمکا دیا۔ میں چپ چاپ ساری حرکتیں دیکھتا رہا۔ پتا نہیں وہ کیا بنا رہے تھے۔

کوئی ہفتے بھر بعد مجھے اپنے دروازے پر روک لیا اور کہا:

''ذرا اندر آئیے......!''

گھر میں دیوار سے لگا میز کا تختہ کھڑا تھا اور اس پر چادر پڑی ہوئی تھی۔ بیکس صاحب نے کسی منجھے ہوئے مداری کی طرح ایک جھٹکے سے چادر ہٹائی اور فرمایا:

''دیکھیے!''

میں نے دیکھا۔ پرانی میز ایک بورڈ بن چکی تھی جس پر بلڈنگ میں رہنے والے تمام لوگوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ اس واقعے کا پس منظر یہ تھا کہ بلڈنگ کی مینیجنگ کمیٹی نے طے

کیا تھا کہ گراؤنڈ فلور پر ایک بورڈ لگنا چاہیے، جس پر رہنے والوں کے نام ہوں مگر یہ مسئلہ بہت دن سے ٹل رہا تھا کہ کوئی ذمہ داری لینے کو تیار نہ تھا۔ بیکس صاحب کے بنائے ہوئے اس بورڈ کو ایک چھوٹی سی تقریب کے ساتھ دیوار پر لگایا گیا۔ مگر جب سکریٹری نے کہا:

"بیکس صاحب، سوسائٹی کو اس کا بل دے دیجیے!"

تو ان کا جواب تھا:

"بائیس روپے۔ بیس ٹیبل کے، دو مزدور کے......!"

"اور آپ نے جو اتنا رنگ پینٹ لگایا۔ لکھنے میں اتنی محنت کی۔ اس کا کیا؟"

"یہ محنت دوستوں کے لیے میرا تحفہ ہے......!"

امید بڑی خوبصورت ہوتی ہے۔ اور بہت ظالم بھی۔ کالج کی اس حسین لڑکی کی طرح جس پر ہر لڑکا عاشق ہوتا ہے اور وہ ہر روز سب کو ایک مسکراہٹ اور بہت سے خواب دے کر چلی جاتی ہے۔ بیکس صاحب بھی امید کے مارے ہوئے تھے۔ انھیں ہمیشہ لگتا تھا کہ کچھ ایسا ہونے والا ہے جس سے سب کچھ بدل جائے گا۔ وہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو مہاراشٹر لاٹری کا ایک روپے والا ٹکٹ لینا کبھی نہیں بھولتے تھے اور جس دن رزلٹ آنے والا ہوتا وہ سویرے ہی اخبار لانے کے لیے دوڑ جاتے، اس وقت ان کی آنکھوں کی مستی اور چال کی تیزی دیکھنے کی ہوتی۔ تین چار دفعہ پانچ پانچ روپے اور شاید ایک دفعہ بیس روپے ملے تھے مگر ٹکٹ خریدنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک دن میں نے انھیں رزلٹ دیکھ کر مایوس ہوتے دیکھا تو سمجھایا:

"ارے بیکس صاحب، یہ بڑا چکر ہے۔ انعام ان کو ملتا ہے جو سینڈیکیٹ بنا کر ہزاروں ٹکٹ خرید لیتے ہیں۔ ایک ٹکٹ لینے سے کچھ نہیں ہوتا......!"

حسب عادت سر جھکا لیا، کچھ سوچتے رہے پھر بڑے ادب سے بولے:

"ہوتا ہے حضور...... بہت کچھ ہوتا ہے۔ میں ایک روپے میں ایک مہینے تک حسین خواب دیکھتا ہوں، یہ بھی تو انعام ہی ہے......!"

میرا دل چاہا کہ ان کی معصومیت کو گلے لگا لوں، وہ صحیح کہہ رہے تھے۔ زندہ رہنے کے لیے

خواب بہت ضروری ہیں اور اگر وہ ایک روپے میں مل جائیں تو اس سے سستا سودا اور کیا ہو سکتا ہے۔ مدھیہ پردیش کے شہر بینا کے رہنے والے تھے۔ آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا تو اندھیرا تھا۔ میرے دیش میں ایک عجیب رواج ہے، یہاں شرافت ان بھاری سیاہ پردوں کو کہا جاتا ہے جو کھڑکی دروازوں پر اس لیے ڈال دیئے جاتے ہیں کہ کوئی گھر کے اندر جھانک کر تنگی غریبی کو نہ دیکھ لے۔ کم عمر عبدالحمید کو بھی یہی سکھایا گیا کہ چٹنی روٹی کھاؤ اور اللہ کا شکر بجالاؤ کیوں کہ باپ کی آمدنی بس اتنی ہی ہے مگر حمید کو چٹنی کچھ زیادہ اچھی نہیں لگی۔ بھوک نے رستہ دکھایا اور محلے کے پینٹر کے پاس جانے لگے جو دکانوں کے سائن بورڈ بناتا تھا۔ رنگ گھولتے گھولتے اور گندے برش دھوتے دھوتے خود بھی لکیریں کھینچنے لگے۔ استاد نے دیکھا تو کہا:

"تیرا ہاتھ اچھا ہے۔ مگر اس چھوٹے سے شہر میں تیری گنجائش مشکل سے نکلے گی۔ اگر ترقی کرنی ہے تو بمبئی جا......!"

حمید نے جیسے تیسے اپنے ایک رشتے دار کا پتہ لگایا جو بمبئی میں رہتے تھے اور پھر ایک دن اس نوجوان نے جس کی مونچھیں بھی نہیں نکلی تھیں، انسانوں کے اس عظیم سمندر میں چھلانگ لگا دی جسے بمبئی کہا جاتا ہے۔ جب وہ بمبئی سینٹرل پر اترا تو اس کی جیب میں ایک پتہ، گیارہ روپے اور پلاسٹک کے تھیلے میں دو جوڑی کپڑے تھے۔

حمید جس رشتے دار کے گھر پہنچا وہ بھی کوئی خوش حال نہیں تھا۔ یوں بھی بن بلایا مہمان آفت جاں ہوتا ہے اس لیے دوسرے دن سے ہی کام کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تاکہ اپنے بوجھ کو خود ہی اٹھا سکے۔ اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ عبدالحمید نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا۔ کہانی کا یہ حصہ بڑا جانا پہچانا ہے اور تصور ہی سے کام چلایا جا سکتا ہے۔

پتہ نہیں قسمت اچھی تھی یا ان کی Lettering کہ سینٹرل ریلوے کے پینٹنگ ڈپارٹمنٹ میں ہیلپر لگ گئے اور دھیرے دھیرے Overseer کے عہدے تک پہنچے۔ رشتے کے جس بھائی کے پاس رہتے تھے اسی کی کسی رشتے دار سے شادی کی اور ایک عام آدمی کی طرح عام سی

زندگی گزارنے لگے اور کر بھی کیا سکتے تھے؟ وہ شرافت جو بیناسے ان کے ساتھ آئی تھی ہمیشہ ساتھ رہی اور اس کے نمونے بار بار دیکھنے کو ملتے رہے۔

شاید ۱۹۷۰ء کی بات ہے بمبئی میں زوردار زلزلہ آیا۔ میرے گھر کے سامنے، میدان کے پار جو بلڈنگ کھڑی تھی وہ ٹیڑھی ہو کر زمین میں آدھی دھنس گئی۔ دیکھنے والوں کے دل ہل گئے۔ یوں بھی زلزلے کی دہشت بہت ہوتی ہے۔ ہماری بلڈنگ کے لوگ بھی چیختے شور مچاتے باہر بھاگنے لگے۔ میں اترتے ہوئے دوسری منزل پر پہنچا تو دیکھا بیکس صاحب واپس جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا: ''ارے آپ اوپر کہاں جا رہے ہیں؟'' کہا ابھی آتا ہوں اور غائب ہو گئے۔ سارے بلڈنگ والے سڑک پر جمع ہو گئے۔ رات کا وقت تھا۔ زیادہ تر روشنیاں بند ہو چکی تھیں اور چاروں طرف لوگوں کا ہجوم تھا۔ اس اندھیرے میں بیکس صاحب بلڈنگ سے باہر آتے دکھائی دیئے۔ ان کی بغلوں میں چٹائیاں دبی ہوئی تھیں۔ انھوں نے اپنے گھر کی چٹائیاں سڑک پر بچھائیں اور اعلان کیا:

''لیڈیز آرام سے بیٹھ جائیں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، اپنی بلڈنگ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔''

اس وقت میں نے اپنی پریشانی میں دھیان نہیں دیا مگر بعد میں سوچا تو بڑی حیرت ہوئی۔ کتنا عجیب آدمی ہے یہ؟...... ہلتی ہوئی عمارت سے بھاگنے کے بجائے چٹائی لینے جا رہا ہے کہ وہ لوگ بیٹھ سکیں جنھیں وہ ٹھیک سے جانتا بھی نہیں! مگر یہی ادا تو تھی کہ وہ آج بھی یاد آتے ہیں اور جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں۔

وہ رات بھی کبھی نہ بھولنے والی رات تھی جب سردار عرفان کی موت کی خبر ملی تھی۔ سردار نے نصابی کتابوں کی کتابت کر کے اور پیسہ پیسہ جوڑ کے باندرہ میں سینٹ میری چرچ کے پاس ایک چھوٹا سا فلیٹ خرید لیا تھا۔ ہم سب اور سب سے زیادہ بیکس صاحب خوش تھے کہ یتیم خانے کی کوٹھری سے فلیٹ تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا، وہ بھی تن تنہا۔ یہ تو ایک کارنامہ ہے جس کی مثال دی جانی چاہیے، مگر سردار کی جنت اور ہماری خوشی کی عمر زیادہ نہیں تھی۔

سردار کا ایک آوارہ رشتے دار اُسے ہمیشہ پریشان کرتا رہتا تھا۔ ایک دن تنگ آکر سردار نے اسے ڈانٹ دیا اور پیسے دینے سے انکار کر دیا۔ اس احسان فراموش نے سردار کو زخمی کر دیا اور بے ہوشی کی حالت میں باہر سے تالا ڈال کر فرار ہو گیا۔ پانچ دن بعد دروازہ توڑا گیا تو لاش برآمد ہوئی جو سڑ چکی تھی......!

ایک عزیز دوست اور پرانے ساتھی کا یہ ہولناک انجام سن کر مجھ پر جو گزری سو گزری، پتہ چلا کہ بیکس صاحب غائب ہیں۔ شام کو سردار کی خبر سنی تو جس حال میں تھے اسی میں باہر نکل گئے اور اب تک واپس نہیں آئے ہیں۔ بچے باندرہ جا کر بھی دیکھ آئے ہیں۔ وہاں کوئی نہیں ہے۔ مکان پر پولیس کا تالا ہے اور لاش مردہ گھر میں ہے۔ سردار کا صدمہ ہی کیا کم تھا کہ یہ پریشانی سامنے آگئی۔ دماغ نے کام کرنا ہی بند کر دیا۔ کچھ سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ وہ کہاں جا سکتے ہیں۔ برداشت نہیں ہوا تو میں بھی ڈھونڈنے کے لیے نکل پڑا۔ رات کے بارہ بجے تک نہرو نگر کے اندھیرے میں بھٹکتا رہا مگر کہیں نہیں ملے۔ تھک کر واپس جا رہا تھا کہ ایک بلڈنگ کے باہر کوئی بیٹھا دکھائی دیا۔ پاس جا کر دیکھا تو بیکس صاحب ہی تھے۔ نالے کی ٹوٹی ہوئی منڈیر پر بیٹھے تھے اور جھاڑیوں کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں پاس جا کر بیٹھ گیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے مگر میں نے روکا نہیں۔ اس ٹوٹی منڈیر پر ہم دونوں نہ جانے کب تک چپ چاپ بیٹھے روتے رہے۔ دور سے بیکس صاحب کے بیٹے بابو کی آواز سنائی دی:

''چچا...... چچا......!'' تو میں کھڑا ہو گیا۔

''چلیے...... سب لوگ آپ کے لیے پریشان ہو رہے ہیں۔''

انھوں نے سر ہلایا اور کھڑے ہو گئے۔

''مگر آپ یہاں آکر کیوں بیٹھ گئے تھے؟''

میں نے پوچھا۔ انھوں نے بڑے دکھ سے میری طرف دیکھا پھر ہاتھ بلڈنگ کی طرف اٹھا دیا۔ اچانک میں نے اس بلڈنگ کو اور دوسری منزل والے فلیٹ کو پہچان لیا۔ وہ اسی لڑکی کا گھر تھا جسے سردار چاہتا تھا......!

نہرو نگر کے دن بڑے اچھے تھے۔ وہاں کے ماحول میں ایک عجیب سا اپناپن تھا۔کسی رشتے کا نام نہیں تھا مگر سب رشتے دار تھے اور جب بچے بڑے ہونے لگے تو ان رشتوں میں اور بہت سی کونپلیں نکل آئیں۔ ہم سب چاچا، ماما، انکل آنٹی نہ جانے کیا کیا بن گئے۔ دکھ سکھ بانٹتے بانٹتے برسیں گزر گئیں مگر مجھے احساس ہی نہیں ہوا یا بیکس صاحب نے ہونے نہیں دیا کہ ان کے گھر میں کوئی چیز دھیرے دھیرے سلگ رہی ہے......

ایک رات کہیں سے لوٹتے ہوئے۔ بہت دیر ہو گئی۔ رات کے دو بجے ہوں گے جب میں نے دیکھا کہ بیکس صاحب سیڑھیوں پر بیٹھے ہیں۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ رکھا تھا اور گھٹنوں پر جھکے ہوئے تھے:

''کیا ہوا بیکس صاحب؟''

میں نے گھبرا کر پوچھا۔ انھوں نے سر اٹھایا۔ سیڑھیوں کی مدھم روشنی میں وہ پیلے اور تھکے ہوئے لگ رہے تھے:

''کیا بات ہے، سب ٹھیک تو ہے نا؟''

میں نے پوچھا۔ انھوں نے اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا اور سر جھکا کر دھیرے سے بولے:

''آج پھر اس پر دورہ پڑا ہے......!''

میں نے ذرا سا آگے بڑھ کر ان کے بند دروازے سے کان لگایا تو اندر سے باجی کی آواز آرہی تھی۔ وہ بیکس صاحب کو گالیاں دے رہی تھیں۔ گندی گندی مردانی گالیاں......

پتہ چلا کہ باجی کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بیکس صاحب جب بھی باہر جاتے ہیں کسی عورت سے ملنے جاتے ہیں۔ باجی نے اس عورت کا پتہ بھی لگا لیا تھا۔ وہ ان ہی کی کوئی رشتے دار تھی اور اپنے شوہر کے ساتھ گھاٹ کوپر میں رہتی تھی۔ اس غریب کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ اس پر کیا الزام لگ چکا ہے اور کس طرح بدنام کیا جا رہا ہے۔ اس پر یہ راز تب ظاہر ہوا جب باجی بنفس نفیس اس کے گھر پہنچ گئیں اور اسے بیکس صاحب سے ناجائز

تعلقات رکھنے کے لیے اتنی گالیاں دیں کہ وہ بے چاری بے ہوش ہو گئی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس کا شوہر سمجھ دار آدمی تھا اور بیکس صاحب کی شرافت اور بے عیب کردار کو جانتا تھا ورنہ خدا جانے کیا ہو جاتا۔ سب نے باری باری سمجھایا مگر باجی کے ذہن سے وہ عورت کبھی نہیں نکلی۔ بات یہاں تک پہنچی کہ بیکس صاحب کو ورک شاپ سے گھر آنے میں منٹوں کی دیر ہو جائے تو گھنٹوں طعنے، کوسنے اور گالیاں دیتی رہتیں۔

بیکس صاحب نے دھیرے دھیرے ہر وہ کام چھوڑ دیا جس میں باہر جانا پڑتا تھا۔ پریس شو بند، اخباری کارٹون اور کالم بند، دوستوں عزیزوں سے ملاقاتیں بند۔ مشاعرے اور ادبی محفلیں تو حرام ہی ہو گئیں کیوں کہ وہ رات میں ہوتی تھیں۔ پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ وہ ریٹائرمنٹ لے کر ہمیشہ کے لیے گوشہ نشین ہو گئے۔ مگر Schizophrenia بہت برا مرض ہے اور جان لے کر ہی پیچھا چھوڑتا ہے۔ اس لیے باجی کی جو حالت تھی وہی رہی...... کمال یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور ہم دوستوں میں سے کسی کو پتہ ہی نہ چلا کہ دیوار پار قیامت آچکی ہے اور حشر برپا ہے۔ اگر اس رات انھیں لٹے ہوئے مسافر کی طرح سیڑھیوں پر بیٹھے نہ دیکھ لیتا تو مجھے بھی کچھ معلوم نہ ہوتا۔ میں نے اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے مشورہ کیا اور دماغ کو سکون دینے والی دوا لا کر دی مگر باجی نے پھینک دی اور رات بھر بڑبڑاتی رہیں:

”حرامی اپنے دوستوں کے ذریعے مجھے زہر دے کر مارنا چاہتا ہے......!“

میں آتے جاتے انھیں دیکھا کرتا تھا۔ مسہری کے کونے پر دیوار سے ٹکے کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے تھے۔ پتہ نہیں پڑھتے تھے یا اس ویرانی کو چھپاتے تھے جس نے ان کی آنکھوں میں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔

ایک دفعہ میں نے مذاق میں کہا تھا:

”نام شخصیت پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اگر آپ کو تخلص رکھنا ہی تھا تو ایسا بے ہودہ لفظ کیوں چنا جسے سن کے ترس آنے لگتا ہے؟“

وہ ہنسے اور فرمایا:

"آئیڈیا تو یہی تھا کہ شاید اسے نام سن کے ترس آجائے۔"

"کس کو ترس آجائے؟"

میں نے پوچھا:

"اوپر والے کو......!"

"بیکس پہ کرم کیجیے سرکار مدینہ!"

اوپر والے کو تو ان پر ترس نہیں آیا مگر میں اور دسنت سوپار کر بہت کڑھتے تھے۔ یہ کیا ظلم ہے کہ بیمار کوئی اور ہے اور اذیت کوئی اور اٹھا رہا ہے۔

۱۹۸۵ء میں جب میں چار بنگلہ منتقل ہو رہا تھا تو ملنے آئے اور حسب عادت سر جھکا کر ادب سے بولے:

"حضور! برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟"

"کہیے!" میں نے کہا۔

"آپ اس گھر کو مت بیچیے......!"

"آپ تو جانتے ہیں بیکس صاحب، جو فلیٹ میں نے لیا ہے اس کی قیمت دینے کے لیے اسے فروخت کرنا ضروری ہے......!"

کچھ دیر تک چپ بیٹھے رہے پھر بھرے گلے سے بولے:

"یہ گھر رہتا تو یہ امید بھی رہتی کہ آپ کبھی کبھی آتے رہیں گے......!"

"ارے کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟......میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں، رشتے نہیں!"

میں نے بہت محبت سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

مگر ایسا ہوا نہیں۔ کچھ تو کام کی زیادتی کچھ دوری۔ نہرو نگر جانا اور پرانے ساتھیوں سے ملنا کبھی کبھی ہوتا تھا کیوں کہ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے اور تقریبات روز تو ہوتی نہیں ہیں، مگر جب بھی ملتے اس طرح ملتے جیسے ملاقاتوں کے بیچ کبھی کوئی فاصلہ نہ رہا ہو۔ میرے گھر وہ دو

بار آئے۔ایک بار اپنی سب سے چھوٹی بیٹی واجدہ کی شادی کی دعوت دینے اور دوسری بار ایک ڈائری دینے کے لیے۔ یہ شاید ۲۰۰۲ء کی بات ہے۔ایک دن فون بجا اور آواز آئی:

"حضور!"

"ارے بیکس صاحب، کیسے ہیں آپ؟"

"اچھا ہوں حضور۔آپ سے ملنا چاہتا ہوں!"

"ضرور ضرور میں کل ہی آجاؤں گا۔"

"آپ زحمت نہ کریں۔میں ہی آجاؤں گا۔آپ کی ایک امانت لوٹانی ہے!"

"ٹھیک ہے آئیے۔سر آنکھوں پر!"

دوسرے دن بیکس صاحب آئے۔سر کے بال ویسے ہی جمے ہوئے تھے۔گردن اسی طرح ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔آدھی آستین کا شرٹ اور ڈھیلی ڈھالی پینٹ۔پینٹ بھی ویسی ہی تھی جیسی ہوتی تھی، مگر ان کے اندر جو آدمی تھا وہ نہیں تھا۔سر کے بال سفید اور کم ہو گئے تھے۔آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں۔ہونٹوں کی شرمیلی مسکراہٹ غائب تھی، بہت کمزور ہو گئے تھے اور لنگڑا کے چل رہے تھے کیوں کہ ایگزیما نے پیر میں زخم ڈال دیے تھے۔میرے سامنے ایک تناور درخت تھا جو کھوکھلا ہو چکا تھا۔ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انھوں نے اخبار میں لپٹی ہوئی ایک ڈائری نکالی اور میری طرف بڑھادی:

"یہ حضور کا کلام ہے جو میں نے محفوظ کر لیا تھا......!"

"میرا کلام؟......مگر میں تو......"

اچانک میری آنکھوں میں وہ ساری شامیں گھوم گئیں جس میں ہم دونوں چائے کی چسکیاں لگاتے اور مشق سخن کیا کرتے تھے۔میری نظر میں وہ ایک دلچسپ مشغلہ ایک تفریح تھی اور بس، مگر بیکس صاحب نے ان اوٹ پٹانگ شعروں کو سنبھال کر رکھا تھا۔بلکہ انتخاب بھی کیا تھا، اپنے اشعار الگ کر لیے تھے اور میرے الگ......میں نے ڈائری کھولی۔ہر صفحے پر میرے شعر نہایت خوش خط لکھے ہوئے تھے اور ہر صفحے کے اوپر موٹا موٹا لکھا تھا:

''ج ج ص ص''۔

''یہ جیم جیم صاد صاد کیا ہے؟''

''حضور کا نام ہے''

''تو جیم صاد لکھ دیتے۔ ڈبل ڈبل کیوں؟''

کچھ شرما سے گئے، مسکرائے اور سر جھکا کر بولے:

''جناب جاوید صدیقی صاحب' لکھا ہے۔ حضور کا نام بے ادبی سے کیسے لے سکتا ہوں''۔

میری اور ان کی وہ آخری ملاقات تھی۔ میں دہلی میں تھا جب خبر ملی کہ انھیں دل کا دورہ پڑا ہے، یہاں بھی ان کی شرافت آڑے آئی اور موت سے تکرار کیے بغیر صرف ایک دن بیمار رہ کر ۲۹ر فروری ۲۰۰۹ء کو وہاں چلے گئے جہاں کچھ نہیں پہنچتا، نہ بیوی کی تذلیل نہ دوستوں کی تعریف......

دونوں سے بے نیاز ہے محوِ سرِ نیاز
کانٹے بچھائیے کہ اب آنکھیں بچھائیے

☆☆☆
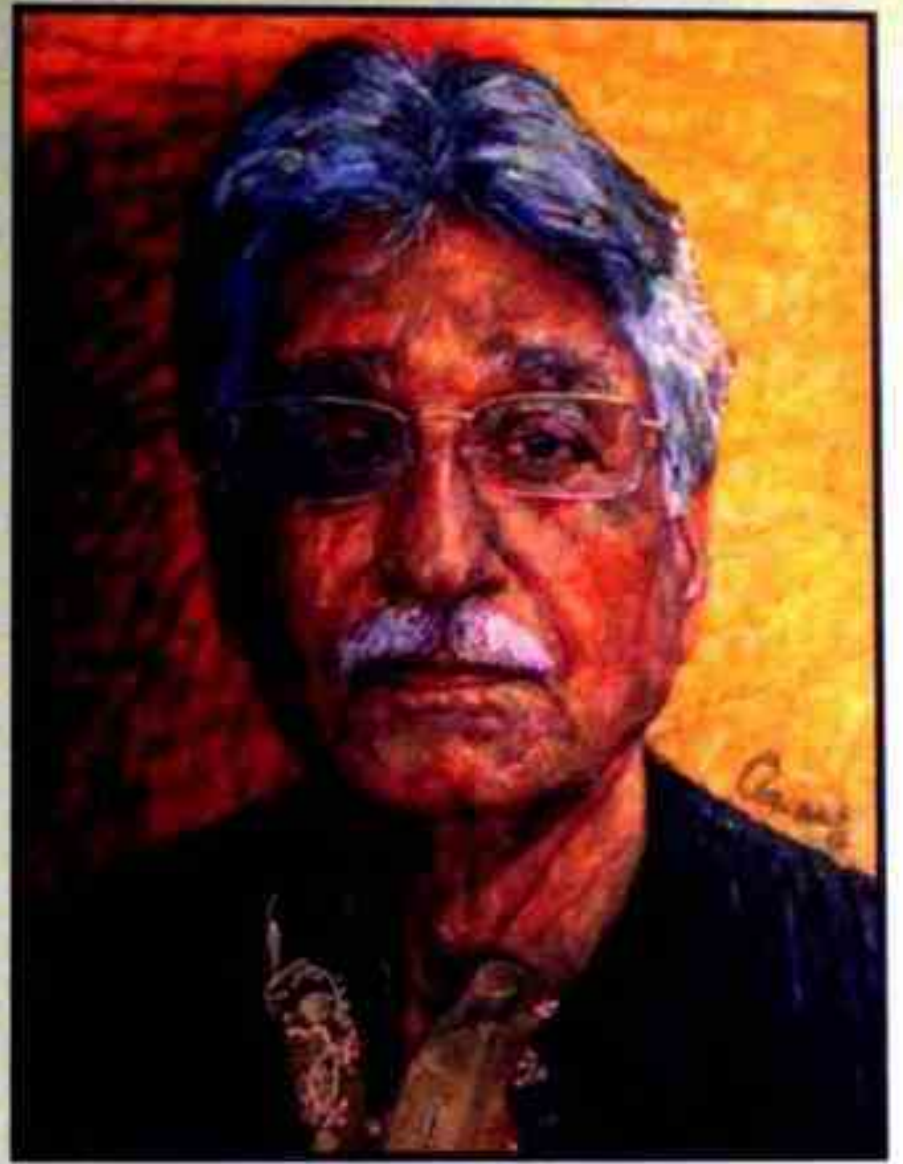
''لغت کہتی ہے: لنگر خانہ وہ مقام
ہے جہاں سے محتاجوں اور
ناداروں کو کھانا ملتا ہے، مگر میرا
خیال ہے کہ وہ بھی لنگر خانے ہیں
جہاں سے ذہن کو روشنی، روح کو
آسودگی اور خوابوں کو حوصلے ملتے
ہیں۔ہم جیسے ناداروں کو غذا فراہم کرنے والے یہ لنگر خانے انسانی شکل میں بھی ہوتے ہیں
بس ڈھونڈنے کے لیے آنکھ اور دستک دینے کے لیے ہاتھ ہونا چاہیے۔
لنگر خانہ اس گلی کا نام بھی ہے جس کی مٹی نے میرے پیروں کے نشانوں کو بڑا ہوتے دیکھا۔
وہ گلی تو وہیں ہے مگر لنگر خانہ میرے ساتھ آگیا ہے!''

— جاوید صدیقی

LANGAR KHANA

by Javed Siddiqi

₹ 250/-

کتاب دار

KITAB DAAR

108/110, Jalal Manzil, Temkar Street, Mumbai - 400 009. Mob.: 9869 321477